کوثر نیازی

فیروز سنز لمیٹڈ لاہور

پہلی بار ——— جنوری 1974ء

تعداد ——— 2000

قیمت ——— 7.50

مطبوعہ فیروز سنز لمیٹڈ لاہور، باہتمام عبدالحمید خان پرنٹر پبلشر

مُندرجات

ابتدائیہ

ذکرِ حسینؑ میری کمزوری بھی ہے اور قوت بھی۔ للہ الحمد کہ اب تک کی ساری عمر مدّاحیِ اہلِ بیت میں گزری ہے مگر یہ مدّاحی محض عقیدت کا نتیجہ نہیں، یہ گہرے تاریخی شعور اور محکم قرآنی حقائق پر مبنی ہے۔ میں نے چاہا کہ اس طرح کا ایک تذکرہ قرطاس و قلم کے بھی حوالے کر دوں۔ یہ کتاب اسی دیرینہ آرزو کی تکمیل ہے۔

میں جانتا ہوں بعض تصریحات پر شاید بعض لوگوں کا ردِّ عمل کچھ زیادہ خوشگوار نہ ہو۔ مجھے ابھی سے تنی ہوئی ابرو کی کمانیں نظر آ رہی ہیں۔ میں جانتا ہوں حق گوئی کے جرم میں طنز و تنقیص کے تیروں کی بارش ہوگی۔

مگر اس جرم سے میں کیسے باز آ سکتا ہوں ؎

کوثرؔ مجھے اس جرم سے انکار نہیں ہے
شیدا ہوں دل و جاں سے میں اولادِ علیؓ کا

کوثر نیازی

کراچی ائیرپورٹ
۲۶ر دسمبر ۱۹۷۳ء

ذکرِ حُسینؓ

(1)

دل و دماغ میں مہروو فا کے افسانے
تصوّرات میں روشن فضائے بدر و حُنین
خوشا یہ اوجِ مُقدّر زہے یہ عزّو شرف
میری زبان پہ جاری ہے آج ذکرِ حُسینؓ

(2)

شہیدِ راہِ محبّت ہے زندۂ جاوید
یہ راز تیری شہادت نے ہم پہ کھول دیا
بُھلا سکیں گے نہ اہلِ وفا تِرا اِحساں
کہ تُو نے موت کی تلخی میں شہد گھول دیا

(3)

بنامِ نسل و نسَب طرزِ بادشاہی نے
قبائے وحدتِ ملّت کو تار تار کیا
وہ ظُلم ڈھائے کہ غیروں کو آ گیا رونا
عجیب رنگ یہ اپنوں نے اِختیار کیا

(4)

نہ فکر سُود و زیاں کی، نہ خوفِ تیغ و تبر
حُسینؓ! راہِ خُدا میں تری یہ بے تابی
بہارِ گلشنِ اِسلام میں پلٹ آئی
کہ تیرے خُون سے قائم ہے اس کی شادابی

(5)

کہیں بھی اہلِ محبّت کی تشنگی نہ بُجھی
فرات و نیل کے ساحل سے تا بہ گنگ و جمن
برائے لالہ و گُل اجنبی ہے فصلِ بہار
خزاں کے دستِ تصرّف میں آگیا ہے چمن

(6)

جہاں پہ آج وُہی شیطنت مسلّط ہے
خُدا کے دِین کا سِکّہ کہیں روا ہی نہیں
قدم قدم پہ گُناہوں کے جال پھیلے ہیں
دل و نگاہ کو حاصل کہیں اماں ہی نہیں

(7)

ہر ایک سمت ہیں عفریتِ ظُلم کے رقصاں
خُدا کے دین کا حلقوم ہے تہِ شمشیر
نئے یزید، نئی کربلا ہوئی پیدا
زمانہ ڈُھونڈ رہا ہے کوئی نیا شبّیر

19 جولائی 1957ء

امام حسینؓ کی قربانی

اسلامی سال تو ہر بار ہی شروع ہوتا ہے لیکن یہ لہولہان مقدس مہینہ اس بار ہمارے لیے جو دُکھ اور عبر میں لے کر شروع ہُوا ہے اس سے معرکہ کربلا کے مناظر پھر آنکھوں کے سامنے آ گئے ہیں. آج بھی اسیرانِ کربلا کی طرح تراڑ کے 93 ہزار اہلِ ایمان گرفتار بلا ہیں ان پر عرصۂ حیات تنگ ہے۔ خیموں میں ان نہتوں پر گولیاں چلائی جاتی ہیں۔ ادھر تو کربلا کی تاریخ دُہرائی جا رہی ہے اور ادھر محرّم الحرام کی آمد پر امن و امان برقرار رکھنے کے لیے امن کمیٹیاں تشکیل دینے کی اپیلیں کی جا رہی ہیں۔ یہ لہُو لہُو سوچیں جو پہلے ہی صدیوں سے نڈھال ہیں ان خبروں پر شدید کرب سے دوچار ہو جاتی ہیں۔

امن کمیٹیاں وہاں بنائی جاتی ہیں جہاں امن کو خطرہ ہو۔ امن کو خطرہ وہاں ہوتا ہے جہاں کوئی متنازعہ مسئلہ موجود ہو۔ اور میں سوچ رہا ہوں کہ مُحرّم کے اس مقدس مہینے میں مُسلمانوں کے درمیان ایسا کون سا متنازعہ مسئلہ ہے جو امن کے لیے خطرہ بن سکے. کون مُسلمان ہے حُسین جس کے ایمان کا حصّہ نہ ہو. کون کلمہ گو ہے جس کی رگوں میں عشقِ حسین خُون کی طرح نہیں دوڑتا. کون سی آنکھ ہے جو امام کی پیاس کے تصوّر میں بھیگ کر فرات نہیں بنتی. کون سا دل ہے جو حُسین کی محبت کو سمیٹنے کے لیے صحراؤں کی طرح پھیل جانے کا خواہش مند نہیں. حُسین پر اگر کوئی تنازعہ ہو سکتا ہے تو ان کی ذات سے عشق کا تنازعہ ہے اور یہ عشق وہ ہے کہ ہر مُسلمان اس میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا تمنائی ہے. حُسین پر اگر کوئی تنازعہ ممکن ہے تو اس جذبۂ قربانی پر ممکن ہے جس کی وہ زندہ مثال ہمارے سامنے پیش فرما گئے. ہر مُسلمان دُوسرے سے بڑھ کر اس قربانی کی تقلید کرنا چاہے گا۔

لیکن عشق کے یہ مُعاملے، محبتوں کے یہ جذبے۔ احترامات کے یہ سلسلے فساد یا عناد کا مُوجب نہیں۔ اخوت و اجتماعات کا سبب بنتے ہیں اور اہلِ درد، اہلِ عشق یا اہلِ ارادت کے لیے امن کمیٹیوں کی ضرورت نہیں۔ امن کمیٹی بنتی تھی ہندوستان میں جہاں کافروں کی طرف سے حُسینؑ کی شان میں گستاخی کا اندیشہ تھا۔ امن کمیٹی بنتی ہے اس مُعاشرے میں جہاں حُسینؑ کی عظمت پر اختلاف ہو۔ لیکن جو ملک مُسلمانوں کا ہو جس کی بُنیاد اسلام ہو، جس کا نظریہ اسلام ہو، جس کے باشندے مُسلمان ہوں وہاں شہادتِ حُسینؑ کا عشرہ شروع ہوتے ہی امن کمیٹیوں کی ضرورت پڑے تو پھر لازماً سوال ذہن میں آتا ہے کہ ہم کسی اجتماعی فریب میں تو مُبتلا نہیں۔ اگر ملک کی بُنیاد اسلام پر ہے تو حُسینؑ کی یاد میں امن کو خطرہ کیسا اور اگر حُسینؑ کی یاد میں امن کو خطرہ ہے تو پھر مُسلمانوں کا معاشرہ کیونکر ہے۔ اگر یہ مُعاشرہ مسلمانوں کا ہے تو پھر عشرہ مُحرّم سے پہلے امن کمیٹیوں کا قیام اسکے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ بات تو یہاں سے شُروع ہوتی ہے۔ کون ہے جسے مُسلمان ہونے سے انکار ہو۔ کون ہے جسے حُسینؑ کی عظمت سے انکار ہو۔ جب سارے ہی حُسینؑ کے سپاہی ہیں۔ جب سب ہی حُسینؑ کے عزادار ہیں۔ جب سب ہی حُسینؑ کے غم خوار ہیں۔ جب سب ہی حُسینؑ کے پیغام کے علمبردار ہیں۔ جب سارے ہی یزیدیت سے بیزار ہیں تو پھر خطرہ کس سے ہے اور اگر خطرہ ہے تو پھر ہم کیوں نہ سوچیں کہ خطرہ پیدا کرنے والے وہی ہو سکتے ہیں جو خود امام حُسینؑ کے لیے خطرہ بنے تھے۔

ہاں ہاں تاریخ کی بات کرتا ہوں جو اپنے آپ کو دُہراتی نہیں آگے بڑھاتی ہے۔ اگر تاریخ اپنے آپ کو دُہراتی تو بار بار حُسینؑ پیدا کرتی۔ بار بار کربلا سجاتی لیکن یہ تاریخ کے بس کی بات نہیں کہ حُسینؑ کو دوبارہ پیدا کر دے۔ حُسینؑ کے سامنے تاریخ لاچار ہے اور تاریخ کے سامنے ہم سب لاچار ہیں۔ آیئے ایک نظر دیکھیں کہ حُسینؑ ہمارے حُسینؑ، ہمارے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حُسینؑ، مظلُوموں کے حُسینؑ، شہیدوں کے حُسینؑ، انسانیت کے حُسینؑ، آخر میدانِ کربلا میں آلِ نبی کے ساتھ عورتوں اور بچّوں کے ساتھ محصُور کیوں کیے گئے۔ کیا یزید ان کا احترام نہ کرتا تھا۔ کیا ان پر تلوار چلانے والے بھی ان کا اسم مُبارک احترام سے نہ لیتے تھے؟ کیا دن بھر پانی بند کرنے والے یہ نہ جانتے

تھے کہ یہ نواسۂ رسول ہے اور کیا خود حسینؑ کو علم نہ تھا کہ وہ اپنے اصول ترک کر کے ایک اشارہ بھی کریں تو یزید کی تمام قوتیں ان کے قدموں میں آ گریں گی۔

پھر یہ تصادم کیا تھا؟ یہ جنگ کیوں تھی؟ اور قربانی کس لیے تھی؟ محققین سے پوچھیے تو لاکھ تاویلات لے آئیں گے۔ مورخین سے پوچھیے تو تاریخ دہرانے بیٹھ جائیں گے۔ مفکرین سے پوچھیے تو فلسفہ تراشنے لگیں گے لیکن میرے لیے' ایک عام مسلمان کے لیے حسین اصولوں کا نام ہے۔ انصاف کا نام ہے۔ ظالم کے خلاف مظلوم کی قربانی کا نام ہے۔ اصول کے لیے جرأت کا نام ہے۔ میں تاریخ سے نہیں پوچھتا۔ میں مفکروں سے نہیں پوچھتا۔ میں مورخوں سے نہیں پوچھتا۔ میں تو آپ سے پوچھتا ہوں کہ بتاؤ حسین کیا ہے؟ کیا حسین نے ایک پرانے نظام سے ٹکر لے کر تاریخ کا رخ نہیں بدلا؟ کیا حسین نے یہ ثابت نہیں کر دیا کہ اصولوں پر سمجھوتہ کسی قیمت پر نہیں ہو سکتا۔ خواہ اس کے لیے معصوم بچوں اور خاندانِ رسولؐ کی بیٹیوں کو تکالیف ہی کیوں نہ برداشت کرنی پڑیں۔ حسین کی جنگ عہدے کی جنگ تھی نہ اقتدار کی۔ وہ اصولوں کی جنگ تھی' وہ حق کی جنگ تھی۔ یہ جنگ کر کے حسین نے دنیا کو بتا دیا کہ طاقت کی فتح کا مطلب حق کی شکست نہیں۔ یزید کربلا میں جیت گیا تھا۔ یزید تاریخ میں ہار گیا۔ حسین شہید ہوتے ہیں تو ظلم دفن ہو جاتا ہے۔

آؤ آج حسین کو یاد کریں۔ آؤ آج اس خون کو یاد کریں جو اصول کے لیے کربلا کی ریت میں جذب ہوا۔ دنیا کی نظروں میں اس وقت بھی ہتھیار جیتے تھے۔ وسائل جیتے تھے۔ دنیا کی نظروں میں وہ خون نہیں تھا جو ریت میں مل گیا وہ اصول نہیں تھا جسے ظلم سے کچلا گیا۔ وہ عزم نہیں تھا جسے پانی روک کر خشک کرنے کی کوشش کی گئی لیکن آج تیرہ سو سال کے بعد دیکھیے فاتح کون رہا اور مفتوح کون۔ آج ہتھیاروں سے فتح حاصل کرنے والا یزید ہمیشہ کے لیے مغلوب ہے اور سچائی کے لیے لاش بن جانے والا حسینؑ رہتی دنیا تک فاتح ہے۔ حسین کو یہ فتح کس نے دی؟ میں ایک سادہ مسلمان کی حیثیت میں صرف یہ جانتا ہوں کہ حسین چونکہ حق پر تھے اس لیے فتح ان کا مقدر تھی۔ کربلا کے معرکے برپا ہوتے ہی رہیں گے۔ اگر یزید کے لشکر خاندانِ رسولِ مقبولؐ کے جگر گوشوں کو تلواروں سے ٹکڑے

کر کے بھی ظلم کا نظام باقی نہ رکھ سکے تو پھر دنیا میں کس کی یہ جرأت ہے کہ ظلم کا سہارا لے کر مظلوم کو کچل سکے۔ حسین نے ہمیں سبق دیا ہے کہ انسان ہتھیاروں سے عظیم ہے۔ حسین نے ہمیں سبق دیا ہے کہ سچائی کی طاقت باطل کو شکست دے سکتی ہے۔ دیکھو اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی دنیا کو۔ کتنے یزیدوں نے کتنے اسلحہ جات سے، کتنے حق پرستوں کو کچلا لیکن آخر فتح طاقت کو ملی یا حق کو؟ آؤ دیکھو دنیا کا منظر۔ ہر جگہ، ہر مقام اور ہر خطے میں ظلم کے خلاف آواز اُٹھ رہی ہے۔ یہ آواز حسین کی آواز ہے۔ پہچانو حسین کو ان آہوں میں ان کراہوں میں اور دیکھو مظلوموں کا حملہ کیا ہوتا ہے۔ وہ اپنے بچوں اور قابلِ صد احترام خواتین کے ساتھ میدانِ جنگ میں اُترتے ہیں۔ کیا کوئی جارح یا جرنیل اس ڈھب سے میدانِ جنگ میں اُترا۔ وہاں ہمارے حسین اُترے کہ خون کی ہولی کھیلنا ان کا مقصد نہ تھا۔ وہ انسانیت کی بقا کے لیے آئے تھے؛ امن کی جنگ لڑنے کے لیے آئے تھے اور امن کی یہ جنگ آج بھی جاری ہے۔ آج بھی ان کی عورتیں اور بچے کھلے میدانوں میں دشمنوں کے درمیان گھرے ہوئے ہیں اور آج بھی ہم امن کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ امن جس کی بنیاد انصاف ہو۔ امن جو خون سے نفرت سکھاتا ہو۔ امن جو قربانیوں کے بعد ملتا ہو۔ جو جنگ کربلا میں شروع ہوئی تھی آج بھی جاری ہے اور دکھی انسانیت آج اس پُرسکون دنیا کو تلاش کرنے میں بے چین ہے جسے پیدا کرنے کے لیے حسین نے وہ عظیم قربانی دی جس کی یاد ہم ہر سال مناتے ہیں اور اس کی یاد میں امن کمیٹیاں تو بناتے ہیں لیکن وہ امن حاصل نہیں کر پاتے جس کے لیے حسین نے جنگ لڑی۔

آئیے! حسین کے نام پر ہم متحد ہیں تو محرم میں دنیا کو متحد ہو کر بھی دکھائیں۔ آئیے آج خلوص دل سے عزم کریں کہ آنے والا نیا اسلامی سال پاکستان کی مضبوطی اور استحکام کا سال ہو۔ اتحاد کا سال ہو۔ امن کا سال ہو۔ امن کمیٹیوں کا سال نہ ہو۔

حضرت امام حسینؓ کی غیر فانی سُنّت

محرّم الحرام اسلامی کیلنڈر کا پہلا اور اس عظیم اور بے مثال واقعہ کا یادگار مہینہ ہے جس نے مسلمانوں کو ہر دَور میں جبر اور استبداد کے سامنے سینہ سپر ہونے اور اسلام کی حفاظت کو زندہ اور جاوداں رکھنے کے لیے اپنی ہستی کو فنا کر دینے کا سبق دیا۔ امام حسین علیہ السلام دین کی بنیادی اقدار اور انسانی زندگی کے اسی ربّانی طریقِ جہد و عمل کی عظمت اور سچائی کا اظہار فرمانے کے لیے میدانِ کربلا میں جلوہ افروز ہوتے تھے اور اپنا اور اپنی اولاد کا خُون دے کر اس طریقِ جہد و عمل کو جاوداں فرما گئے۔ ان کا راستہ روکنے کے لیے طاغوتی قوتیں ہجوم در ہجوم آئیں۔ انھوں نے سچائی کے اس عظیم اور بے مثل علمبردار کا سر کاٹ کر نیزے پر بلند کر دیا اور خوشیوں کے شادیانے بجائے لیکن تاریخ نے دیکھا کہ سچائی خُون آلُود ہونے کے باوجُود آج کے دن تک سر بلند ہے اور جھوٹ کی وقتی و ہنگامی فتح و کامرانی کو فنا کے گھاٹ اُترے مُدّتیں گزر گئی ہیں۔ حُسین علیہ السّلام آج بھی زندہ ہیں اور یزید پر واقعہ کربلا کے چند سال بعد ہی ابدی موت طاری ہو گئی تھی۔ یزید کی ابدی موت اور حُسین کی تا قیامت زیست وہ عظیم حقیقت ہے جسے تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

ہر سال مُحرّم کا مہینہ جب تک آتا رہے گا یزید کی ابدی ہلاکت اور حسینؑ کی تا قیامت زیست کی یاد تازہ ہوتی رہے گی اور مسلمانانِ عالم ذکرِ حسینؑ سے اپنی محفلوں کو ہمیشہ بُقعۂ نُور بنائیں گے طریقہ جو بھی ہو گا اس میں مشترک بات یہ ہو گی کہ سچائی کو سربلند رکھنے کے لیے جان دے دینا مہنگا سودا نہیں۔ یاد کا یہی مشترک پہلو اسلام کی وساطت سے مسلمان قوم کو نیا خُون اور نیا ولولہ عطا کرتا ہے اور میں تو سمجھتا ہوں کہ اسلامی ممالک کی حالیہ تاریخ میں جو نئے سویرے پھُوٹے ہیں وہ

اسی حسینی اُفق کا فیض ہیں۔ افریقہ میں، مشرقِ وسطیٰ میں، جنوب مشرقی ایشیا میں ایک نہیں کئی سویرے اُبھرے ہیں اور ہر سویرے کی شفق میں خونِ حسینؑ کی سُرخی ہے۔

ابھی چند ماہ ہوئے لاہور، سیالکوٹ اور قصور کے آسمانوں پر ایسا ہی سویرا ہوا اور ایسی ہی پَو پھٹی تھی۔

لاہور میں بھی سیالکوٹ میں بھی اور قصور میں بھی نئے دَور کی یزیدی قوتیں حسینی عَلم کو سرنگوں کرنے اور کربلائے وقت کے حسینیوں کی شاہ رگوں کو کاٹنے کے لیے اپنے بارودی نیزے اُوپر اُٹھائے آندھیوں اور طوفانوں کے سے انداز میں ہر سُو چھا گئی تھیں مگر اس کے باوجود بارودی نیزوں کی انیوں کے مُنہ پاکستانی حسینیوں نے اسی طرح پھیر دیے جس طرح افریقی حسینیوں نے سامراجی نیزوں کے مُنہ پھیرے ہیں کہ نئے دَور کے حسینیوں کو جس طرح حسینؑ کی طرح سر کٹانے میں کوئی تذبذب اور ہچکچاہٹ نہیں ہے اسی طرح وہ جبر و قہر کے جبڑے توڑنے میں تامّل نہیں برتتے ہیں اور جانتے ہیں کہ کربلائے معلّٰی میں تو حسین علیہ السلام کو اپنے عم زاد وحشی گمراہوں اور باطل پرستوں سے سابقہ پڑا تھا۔ حسین علیہ السلام کے ہاشمی خُون سے جس اموی ہاتھ نے کربلا کے ریگ زار کو سُرخ کیا تھا وہ اس اُمیّہ کی نسل کا ہاتھ تھا جو ہاشم کے باپ عبدالمناف اور اُن کے بھائی عبدالشمس کی اولاد تھا۔

بلاشبہ کربلا کے حسینؑ نے جو سُنّت کربلا کی ریت کے سپُرد کی تھی اس کی ہر کڑی قربانی کی بھٹّی میں پگل کر آہن بنی تھی۔

بلاشبہ کربلا کے حسین نے سر کٹانے اور خون دینے کو حیاتِ جاوداں کا عنوان بنایا تھا مگر نئے دور کے حسینی مقابل و حریف کے سر کاٹنے اور خُون بہانے کو بھی سُنّتِ حسینی جانتے ہیں کہ حسین علیہ السلام جس بلند مقام باپ کے بیٹے تھے، اُن کا اسمِ گرامی اور نامِ نامی علی شیرِ خدا تھا جو کفر و باطل کے جنگل میں پھیلے حریف درندوں کے جسم و جان کو چیرنے پھاڑنے میں بالکل تامّل نہیں برتتے تھے۔ وہ خیبر شکن تھے انھوں نے اسلام کی روشنی کو قلعہ خیبر کے در و دیوار پر قیامت

تک کے لیے مُرتسم کرنے کے لیے بابِ خیبر کو حیدری توانائی کے ساتھ اکھاڑ پھینکا تھا اور ہر اس یہودی پہلوان کے گرانڈیل جسم کی تکا بوٹی کردی تھی جو میدانِ جنگ میں ان کے رُو برو آیا۔

یہی وجہ ہے کہ نئے دور کے پاکستانی، افریقی اور ایشیائی حُسینیوں نے پاکستان میں بھی، افریقہ میں بھی اور ایشیا میں بھی جبر دتی طاقتوں کے خلاف جو نئی صف آرائی کی ہے جن ابوابِ خیبر کو اکھاڑ پھینکا ہے اور جن بھارتی اور مغربی سامراجی درندوں کے جبڑے توڑے ہیں وہ افقِ عالم کے نئے سویروں کا روشن عنوان بن گئے ہیں اور وہ ساری کی ساری روداریں پھر سے تازہ ہو گئی ہیں جو علیؑ شیرِ خدا نے معرکۂ خیبر میں اپنی شمشیرِ بُراں سے رقم کی تھیں۔

میرے نزدیک ہر سال کا مُحرّم جب آتا ہے تو جہاں کربلا کے ریگ زار میں شامل خُونِ حسینی کی سُرخی نظرِ عالم کے لیے وجہِ عبرت بنتی ہے، وہاں حیدری شمشیر کی کاٹ اور شیرِ خدا علیؑ پدرِ بزرگوارِ حُسینؑ کے بازوئے خیبر شکن کی توانائی بھی رگ و جانِ ملت میں خونِ تازہ کو روانی عطا کرتی ہے کہ کربلا کی تاریخ صرف محرم کے دس پہلے دنوں کی تاریخ ہی نہیں ہے، اسلام کے پہلے معرکہ جنگِ بدر سے لے کر غزوہ خیبر، غزوہ اُحد، واقعہ خندق، جنگِ ہوازن، فتح مکہ، جنگِ قادسیہ، جنگِ یرموک اور ہر اس معرکہ وجنگ کی تاریخ ہے جو اسلام کے قدسیوں نے حُسینؑ کے نانا، حسینؑ کے باپ اور حُسینؑ کے باپ اور نانا کے وفادار ساتھیوں کی قیادت میں اس وقت تک لڑی تھیں جب تک حسینؑ مدینہ سے چل کر مکہ اور مکہ سے چل کر کوفہ کی طرف روانہ ہوئے

ہر سال کا مُحرّم جب طلوع ہوتا ہے تو پوری وہ تاریخِ اسلام، عالمِ اسلام پر طلوع ہو جاتی ہے جو حُسین علیہ السلام کے سفرِ کربلا کے وقت تک ملتِ مُسلمہ نے اپنی جدوجہد کے آہنی قلم سے صفحۂ جہان پر رقم کی تھی۔

بلکہ میں تو سمجھتا ہوں اور بجا طور پر سمجھتا ہوں کہ ہر سال کا مُحرّم کربلا کے محرّم سے پہلے کی تاریخ اسلام کے ساتھ کربلا کے بعد کی تاریخ کو بھی اپنے ہمراہ ذہنِ عالم پر اجاگر کر دیتا ہے اور مسلمانانِ جہاں کے ساتھ ساتھ پوری دنیا کو اس حقیقت کی طرف متوجّہ کرتا ہے کہ حسینؑ

پر جو محرّم امیر معاویہ کے نالائق بیٹے یزید کے دورِ حکومت میں طلوع ہُوا تھا وہ پہلے سالِ ہجری سے لے کر ہادیٔ اسلام علیہ التحیۃ والسّلام کے وصال تک کوئی گیارہ بار طلوع ہو چُکا تھا اور اس مدت میں اسلام سرزمینِ عرب کی اتنی بڑی قوّت بن چکا تھا کہ حضور سرورِ کون و مکاں صلّی اللہ علیہ وسلّم اس وقت کی دو بڑی عالمی قوتوں دولتِ ایران و دولتِ رومہ میں سے ایک قوّت یعنی دولتِ رومہ کی عرب سے ملحق سرحد کی ایک بڑی چوکی تبوک پر اسلامی برتری کے عَلم گاڑ آئے تھے۔ اور وصال سے کچھ دن پہلے ہزاروں جاں نثاروں کا لشکر جوفِ مدینہ میں جناب اسامہؓ بن زیدؓ کے علم تلے جمع کر دیا تھا کہ شام کے اس سرحدی مقام کو روانہ ہو جہاں جناب اسامہؓ کے باپ جناب زیدؓ بن حارث اور جناب جعفرؓ بن ابی طالب نے رومی اور شامی فوجوں سے نبرد آزمائی کے وقت شہادت پائی تھی۔[1]

قدیم مورخینِ اسلام نے اس بات پر اتّفاق کیا ہے کہ جناب اسامہؓ بن زیدؓ کی قیادت میں جو فوج حضورؐ نے جوفِ مدینہ میں جمع کی تھی اس کے ذمّہ جو اہم فریضہ تھا اس کی دو شقیں تھیں۔ ایک شق جناب زیدؓ بن حارثہ، جناب جعفرؓ بن ابی طالب اور ان کے ساتھیوں کی شہادت کا انتقام تھا اور دوسری شق شامی و رومی فوجیوں کو للکار اور تنبیہہ مہیا کرنا تھی۔ حضورؐ کے جانشین جناب ابی بکر صدیقؓ نے حضور کے وصال سے پیدا ہونے والی سیاسی صورتِ حال کی ابتری کے باوجود جناب اسامہؓ کی لشکر کشی کو ملتوی نہ کر کے اور فوجِ اسلام کو شام کی سرحد کے متعینہ مقام تک پہنچا کر جو حکمتِ عملی اختیار کی تھی اس سے اسلام بہت سربلند ہُوا تھا۔ اور جناب ابوبکرؓ کے مختصر عہد میں اسلام نے پُورے حجاز، نجد، یمن وحضرموت اور بحرین پر جو سیاسی غلبہ حاصل کر لیا تھا فوجِ اسامہ کی لشکر کشی اس کا بنیادی سبب تھی۔[2]

یہاں یہ بات خصوصی توجہ کے قابل ہے کہ جناب اسامہ بن زیدؓ جس فوج کو اپنے ساتھ لیکر

---

[1] ابنِ اسحاق و ابن ہشام جزء ۲ ص ۲۱۳ ۔ الطبری جزء ۴ ص ۲۲۴ ۔ القسطلانی جزء اول ص ۱۷۲

[2] ابنِ اثیر جزء ۴ ص ۱۲۲ ۔ ابن کثیر جزء ۴ ص ۳۲۳

سُوئے شام روانہ ہُوئے تھے اس کا اجتماع محرم ۱۱ھ میں شروع ہُوا تھا اور صفر میں اس کی تکمیل ہُوئی [1] یعنی جوفِ مدینہ میں اسلام کے مستقبل کو تابناک سے تابناک تر بنانے والے قدوسی محرّم ۱۱ ہجری میں اسلام کی مرکزی چھاؤنی میں مجتمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔

یہ بات اہلِ علم سے پوشیدہ نہیں ہے کہ جناب اسامہؓ کے یہ تیس ہزار رفقاء مرکزی حکومت کی سٹینڈنگ آرمی کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہ سارے کے سارے صحابہؓ تھے۔ ان سب نے حضورؐ کی صحبت پائی تھی اور حضورؐ کی تربیت سے نوازے گئے تھے۔

بلاشبہ جناب ابی بکر صدیقؓ کے عہدِ مبارک میں اسلام جب عملاً جزیرہ نمائے عرب کی قوّت حاکمہ بنا اور اسلامی سپاہ مختلف حصّوں میں بٹ کر عراق، شام، مصر، بحرین اور دوسرے اکنافِ عالم کی طرف چلی تھی تو بہت سے نومُسلم اور بہت سے وہ لوگ جنھیں صحابہ ہونے کا شرف حاصل ہوا تھا اور جنھوں نے حضورؐ کی تربیت نہیں پائی تھی اس میں شامل ہو گئے تھے اور بعد میں آنے والے یہی وہ موقع پرست لوگ تھے جنھوں نے شام میں پہلے امیر معاویہ اور بعد میں یزید کو قوت بہم پہنچائی تھی اور یہی وہ لوگ تھے جو کربلا کے قیامت صفت ہنگامے کو برپا کرنے کا موجب بنے تھے۔

تاریخ نے بڑے واشگاف الفاظ میں اعتراف کیا ہے کہ کربلا میں جو یزیدی فوج ابنِ زیاد اور شمرِ لعین کی ساتھی بنی تھی اس کے سارے کے سارے افراد حضورؐ کے وصال کے بعد مسلمان ہُوئے تھے۔ انھوں نے حضورؐ کی صحبت نہیں پائی تھی اور نہ حضورؐ کا الہامی ہاتھ ان کے سروں پر سایہ فگن ہُوا تھا۔

یہ لوگ بہادر یقیناً تھے۔ یہ لوگ خون بہانے کا خُوب حوصلہ رکھتے تھے۔ انھوں نے مصری شامی اور عراقی میدان ہائے جنگ میں تلواروں اور نیزوں کے تماشے خُوب رچائے تھے اور اس اسلامی سپاہ کو یقیناً توانائی بہم پہنچائی تھی جو جناب اسامہؓ بن زیدؓ کے ہمراہ محرّم ۱۱ ہجری میں جوفِ

[1] ابنِ اسحاق

مدینہ میں اُتری تھی۔

مگر بخدائے ربّ کعبہ! اس فوج کا ایک سپاہی بھی اس کربلا کا تماشائی نہیں بنا تھا جس نے اسلام کے ہادی علیہ التحیہ والسلام کے جگر گوشہ حسینؑ کے پاک خون کو بہایا تھا۔ میرا دعویٰ ہے اور میرے پاس اس کے تاریخی ثبوت ہیں کہ محرم ۶۱ ہجری تک اسلام لانے والوں اور حضورؐ پاک کی صحبت کا شرف پانے والوں میں سے کوئی ایک فرد بھی حضورؐ کے نواسے امام حسین علیہ السّلام کے سامنے حریف بن کر کھڑا نہیں ہُوا تھا۔

صحرائے حجاز کی ریت بڑی ظالم اور قصاب صفت ریت ہے۔ وہ سارے بدبخت صحرائے حجاز اور نجد کے بے آب وگیاہ علاقہ کے باشندے تھے جو کوفی فوج میں شامل ہو کر امام حسین علیہ السّلام کے سامنے صف آرا ہوئے تھے اور یہ سارے بدبخت اسلام کو قوتِ غالبہ پا کر دنیاوی لالچ کی خاطر اسلام سے وابستہ ہُوئے تھے

دراصل یہ ان قبیلوں کے لوگ تھے جو حضورؐ کے وصال کے بعد مُرتد ہوئے تھے اور اسلام کے مرکز مدینہ پر چہار طرف سے حملہ آور ہونے کی جُرأت کی تھی۔ ان میں بنو سلیم، بنو حنیفہ، بنو اسد کے لوگوں کی اکثریّت تھی۔

جن لوگوں نے تاریخ اسلام کو بنظرِ غائر پڑھا ہے وہ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ بنو اسد، بنو سلیم اور بنو حنیفہ کی غالب تعداد مرتدین پر مشتمل تھی۔

جناب ابو بکرؓ کی صلابتِ فکر اور سیاسی سُوجھ بُوجھ اور جناب خالدؓ بن ولید کے غیر معمولی تہوّر اور شجاعانہ عمل کے سبب گمراہی کے راستہ سے مُنہ پھیر کر، ان کے اسلام میں دوبارہ داخل ہونے پر میں حرف گیری نہیں کرتا اور ایسا کر بھی کیسے سکتا ہوں جبکہ خلیفہ اوّل اور جانشین اور وفادار رسُولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو حنیفہ، بنو اسد اور بنو سلیم کے ٹھکانوں کی سمت روانہ ہونے والی فوجوں اور ان کے سربراہوں کو بنیادی حکم دیا تھا کہ جو بستی تمہاری اذان سننے کے بعد تمہارے ساتھ نماز میں آن شامل ہو، جو اسلام کی اطاعت و فرمانبرداری کا عہد کرلے' اس پر حملہ آور نہ ہونا اور اس کے اسلام

کو قبول کر لیتا۔

مگر اس کے ساتھ ساتھ نئی نسل کے مسلمانوں پر یہ حقیقت بھی واضح کر دینا ضروری جانتا ہوں کہ کربلا میں حسین علیہ السلام کے سامنے جن لوگوں نے صفیں باندھی تھیں۔ جنھوں نے دریائے فرات کا پانی ان پر بند کیا تھا۔ جنھوں نے ان پر اور ان کے ساتھیوں پر تیر چلائے اور تلواریں سونتی تھیں، یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے الیمامہ کے معرکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثار ساتھیوں کے ساتھ بڑی سخت جنگ لڑی تھی اور کوئی ساڑھے سات سو حفاظ کو شہید کر دیا تھا۔[1]

یقیناً اسلام نے الیمامہ کی جنگ جیت لی اور باقی ماندہ بنو حنیفہ اسلام لے آئے اور جناب خالدؓ بن ولید نے ان کو امان بخش دی تھی۔

لیکن بہرحال یہ حقیقت جھٹلائی نہیں جا سکتی کہ ان لوگوں کا اسلام معیاری نہ تھا معرکہ کربلا کبھی وقوع میں نہ آتا اگر یہ لوگ اسلام کو سمجھے ہوتے۔ اگر اسلام کی رُوح ان کے دلوں میں بس چکی ہوتی اور معرکہ کربلا تو معرکہ کربلا ہے۔ میرا تو یقین ہے کہ اگر یہ لوگ اسلام سے مخلص ہوتے، اگر اسلام نے ان کے دلوں میں گھر کیا ہوتا تو جناب علیؓ مرتضٰے اور امیر معاویہ کے مابین جو جنگیں شہادت عثمانؓ کے بعد اور جناب علیؓ مرتضٰے کے مسند نشینِ خلافت ہونے کے وقت ہوئی تھیں۔ وہ بھی وقوع میں نہ آ سکتیں کہ اسلام ان جنگوں کو اس اخوّت اور بھائی چارے اور جماعتی اتحاد کے بالکل منافی جانتا تھا جسے پیدا کرنے کے لیے وہ اس دنیا میں آیا تھا۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کا مقصد جہاں کلمۃ اللہ ھی العلیا کی منادی تھی وہاں وہ اس لیے بھی اس عالم آب و گل میں نبی بن کر آئے تھے کہ ایک ایسی برادری اور ایک ایسی ملت کو وجود میں لائیں جس کے افراد میں من و تو کی کوئی تمیز باقی نہ رہے اور جو قبائلی تعصب اور رنگ و نسل کے فرق کو بالکل بھول جائے۔

---

[1] ابن اثیر جز ۵ ص ۱۳۴

اور اہلِ علم سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ حضور سرورِ کون و مکاں صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تربیتِ صالح جن نفوسِ قدسیہ نے پائی تھی وہ "من و تو" کا فرق بالکل بھول گئے تھے اور باہم ایک دوسرے کے ہمدرد، جاں نثار اور سچے رفیق بن گئے تھے اور یہ رفاقت مثالی رفاقت تھی۔ ایسی رفاقت پہلی کسی اُمت اور پہلی کسی جماعت میں کبھی تاریخ کے کسی دور میں پیدا نہ ہو سکی تھی۔

اور یہ سارے دُھندلکے اسلامی تاریخ کے، جن کے بطن سے شہادتِ عثمان، جنگِ جمل اور کربلا ایسے واقعے پیدا ہوئے، صرف ان لوگوں کے پیدا کردہ تھے جو اسلام کے سیاسی غلبہ کے بعد مسلمان ہوئے تھے۔ اور میرے پاس تو تاریخ کا یہ استشہاد بھی موجود ہے کہ حضرت عثمان کی شہادت، جسے بعض فلسفی مؤرخینِ اسلام نے جنگِ جمل، امیر معاویہ اور حضرت علیؓ کے مابین معرکہ آرائی اور واقعۂ کربلا کی اصل بنیاد قرار دیا ہے، محض ان لوگوں کے سبب تاریخ کا اندوہناک باب بنی تھی جو اسلام سے مخلص نہ تھے۔ جو اسلام میں اس لیے شامل ہوئے تھے کہ اسلام کی وحدت و مرکزیت اور ملت کے اتحاد کو مجروح کریں۔

بلاشبہ انھوں نے اپنے نام مسلمانوں کے سے رکھ لیے تھے۔ بلاشبہ وہ مصر، کوفہ اور بصرہ کی اسلامی چھاؤنیوں کے اندر سے نکل کر مدینہ آئے تھے لیکن ان میں غالب تعداد ان کی تھی جنھوں نے الیمامہ اور دوسری جنگوں میں اسلام سے ٹکر لی تھی۔ اور صرف اس لیے اسلام قبول کیا تھا کہ اسلام نے ان کی تلواریں توڑ دی تھیں اور ان کے نیزوں کی انیوں کی تندی و تیزی چھین لی تھی۔

یہ محاکمے کا وقت نہیں ہے البتہ میں یہاں یہ وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت جن کوفیوں، بصریوں اور مصریوں کے ہاتھوں ہوئی، ان کا تعلق اسی فاسد گروہ سے تھا جو الیمامہ اور بنی اسد اور بنی سلیم کے ٹھکانوں میں اسلام کے مدِمقابل ہوا تھا۔ اس گروہ نے جنگِ جمل کی آگ بھڑکائی۔ اسی گروہ نے امیر معاویہ اور جنابِ علی مرتضیٰؓ میں خلیج حائل

کی اور یہی گروہ حادثۂ کربلا کا موجب بنا۔

یہ گروہ اسلام کی اوڑھنی نہ اوڑھ لیتا۔ یہ اگر جھوٹی اذانیں دے کر اور جھوٹی نمازیں پڑھ کر پہلی اسلامی فوج اور پہلے مُسلمان سپہ سالاروں کو اپنے اسلام کی صداقت کا یقین نہ دلاتا تو اسلام کی تاریخ میں کوئی دُھندلکا پیدا نہ ہوتا۔ نہ شہادتِ عثمانؓ وقوع میں آتی، نہ جنگِ جمل کی آگ بھڑکتی اور نہ کربلا کا مُحرّم اتنی اندوہناک کیفیت کا حامل ہوتا کہ مسلمان نسلیں تیرہ سو سال سے اس کے طلُوع ہوتے ہی اپنے گریبان چاک چاک کریں اور اس المیہ کی اندوہناکی پر آنسو بہاتیں۔

سانحۂ کربلا کا پس منظر

تاریخِ عالم کے بعض ایسے سوانح جنہوں نے نہ صرف واقعات اور حالات کے دھارے کا رخ موڑ دیا ہے بلکہ بعد میں آنے والے کروڑوں انسانوں کے قلوب و اذہان کو بھی بے حد متاثر کیا ہے۔ ان میں سانحہ کربلا ایک نہایت منفرد اور بے حد اہم خصوصیتوں کا حامل ہے۔ اس عظیم تاریخی سانحہ کی وجہ سے تاریخ اسلام کے دھارے کا رخ یکسر بدل گیا اور اگرچہ فوری طور پر خاندانِ بنو امیہّ کی حکومت کے لیے راستہ ہموار ہو گیا لیکن آگے چل کر ان تمام کارناموں کے باوجود جو بنو امیہّ خاندان کے بعض لائق، جری اور حوصلہ مند خلفاء نے سر انجام دیئے اور حکومتی شان و شوکت، رعب اور دبدبہ کے علی الرغم اس خاندان کو عامۃ المسلمین کے دلوں میں محبت کا وہ مقام حاصل نہ ہوا جو بصورت دیگر حاصل ہوتا۔ اس کے برعکس یزید اور اس کے مشیروں کی ایماء اور اس کی سپاہ اور سرداران سپہ کے ہاتھوں حادثہ کربلا میں جو افعال سرزد ہوئے ان کا ایسا شدید ردِّ عمل ہوا کہ خود آلِ امیہّ کو بھی اموی کہلانا گوارا نہ رہا، گویا معنوی طور پر یہ خاندان دنیا سے بالکل نابود ہو گیا جب کہ دوسری طرف مقتلِ کربلا میں خانوادۂ رسولؐ کے بچ جانے والے واحد نوجوان کی اولاد آج بھی دنیا کے ہر خطے میں لاکھوں کی تعداد میں موجود ہے۔

کسی بھی تاریخی واقعہ کی اہمیت کا تعیّن کرنے کے لیے ہمیں تین پہلوؤں

٢٠٠٧٣

سے اس کا جائزہ لینا پڑتا ہے۔ یعنی وہ واقعہ

کس کے ساتھ پیش آیا

کیسے پیش آیا اور

کیوں پیش آیا؟

وہ شخص جس کے ساتھ کوئی تاریخی واقعہ پیش آیا ہو واقعہ کے مرکزی کردار کی حیثیت رکھتا ہے اور اس مرکزی کردار کی شخصیت سے واقعے کی اہمیت کی سطح متعین ہوتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے گرد و پیش سینکڑوں آدمی روزانہ دنیا سے کوچ کرتے ہیں اور اسی طرح سینکڑوں نئے مسافر عرصۂ حیات پر نمودار ہوتے ہیں اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی یا کچھ لوگوں کو خبر ہوتی ہے تو وہ اسے ایسا ہی سمجھتے ہیں جیسے کسی درخت کی کوئی ٹہنی ٹوٹ کر زمین پر آ گری ہو یا کسی جھاڑی کے ساتھ ایک نیا پھول کھل اٹھا ہو لیکن کبھی کبھی کوئی ایسا شخص نشانۂ اجل ہو جاتا ہے کہ اس کے مر جانے سے لاکھوں انسانوں کی کمرِ ہمت ٹوٹ جاتی ہے یا ایک ملک کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے یا ایک تحریک کی موت واقع ہو جاتی ہے، یا اس کی قربانی سے ایک تحریک کو نئی زندگی مل جاتی ہے۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ قتل و خونریزی کے واقعات ہر ملک میں رونما ہوتے رہتے ہیں لیکن کبھی کبھی کسی ایک شخصیت کے قتل کر دیے جانے سے تہلکہ مچ جاتا ہے۔ بلکہ ایسی آگ بھڑک اٹھتی ہے کہ کتنے ہی ملکوں اور قوموں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے، جون ۱۹۱۴ء میں سارایا وو کے مقام پر آسٹریا کے شہزادے کو گولی کا نشانہ بنایا گیا تو اس ایک گولی نے دنیا بھر کے اسلحہ خانوں کو ایسی آگ دکھائی کہ پوری دنیا ایک ہولناک جنگ کی گرفت میں آ گئی اور چار سال تک دنیا کی مختلف اقوام کشت و خون میں مصروف رہیں۔

لاکھوں ایسے افراد جنہوں نے شہزادے کا نام بھی نہ سنا تھا بلکہ آسٹریا اور سارایاوو تک کے ناموں سے محض ناآشنا تھے اس نامعلوم قاتل کی ایک گولی کی بھینٹ چڑھ گئے۔

واقعۂ کربلا کے مرکزی کردار حضرت امام حسینؓ کے نام نامی اور اسم گرامی سے کون شخص واقف نہیں۔ حسب ونسب کے اعتبار سے آپ اس ذاتِ والا صفات کے نواسے تھے جو وجہ تخلیق کائنات اور باعثِ تکوین حیات تھی اور خود آنحضورؐ کے دادا آپ کے پڑدادا تھے۔ آپ کی ولادت ہوئی تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم فوراً تشریف لائے اور حضرت صفیہؓ کو آواز دے کر فرمایا کہ میرا بیٹا میرے پاس لاؤ۔ جب بچے کو ایک سفید چادر میں لپیٹ کر آنحضورؐ کے پاس لایا گیا تو حضورؐ نے اسے پیار کیا اور اس کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہی۔ نام کے متعلق پوچھا تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے عرض کیا "جو نام اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہو وہی بہتر ہے۔" چنانچہ امام عالی مقام کا نام حسینؓ رکھا گیا۔ یہ نام بھی اللہ کی طرف سے نازل ہونے والی وحی کے مطابق رکھا گیا اور علامہ ابن سعد نے طبقات کبریٰ میں عمران بن آل سلیمان کی روایت سے لکھا ہے کہ جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حسنؓ اور حسینؓ یہ دونوں نام اسمائے اہل جنت میں سے ہیں۔

یہ روایت بھی موجود ہے کہ جس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کسی شخص کا نام محمدؐ نہیں رکھا گیا اسی طرح حضرت علیؓ، حسنؓ اور حسینؓ بھی ایسے نام ہیں کہ ان سے پہلے کسی شخص کے یہ نام نہیں ہوئے۔ گویا یہ نام ازل سے انہی مبارک اور مقدس ہستیوں کے لئے مخصوص اور محفوظ تھے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دونوں نواسوں حضرت امام حسنؓ اور

حضرت امام حسینؓ سے جو بے پناہ محبت تھی اس کا تذکرہ احادیثِ رسولؐ اور
اور کتبِ سیر میں نہایت کثرت اور تفصیل سے موجود ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ
تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھا اور
دونوں کانوں سے سنا کہ جنابِ رسالت مآبؐ امام حسینؓ کے دونوں ہاتھ پکڑے
ہوئے تھے اور امام حسینؓ کے دونوں قدم سینۂ مبارک پر تھے اور آپ فرما
رہے تھے کہ اے مچھر کی سی آنکھ کی طرح ننھے بچے آگے بڑھ سچ سچ۔ راوی کا
بیان ہے کہ شاہزادہ اتنا آگے بڑھا کہ اس کے دونوں قدم حضورؐ کے سینۂ مطہر
پر رکھے گئے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ اپنا منہ کھول اور آپ نے ان کے منہ
کو چوما پھر فرمایا، پروردگارا میں اس کو محبوب رکھتا ہوں تو بھی اسے محبوب
رکھ[1] ابو ہریرہ ہی کی روایت ہے کہ آنحضرتؐ مسجد میں تشریف رکھتے تھے کہ
جناب امام حسینؓ تشریف لائے اور آنحضرت کی آغوشِ مبارک میں لیٹ گئے
اور اپنی انگلیاں آپ کی ریشِ اقدس میں ڈالنے لگے۔ آنحضرت صلعم نے آپ
کے منہ کو کھولا اور اپنا منہ آپ کے منہ پر رکھا پھر فرمایا پروردگار! میں اس
کو محبوب رکھتا ہوں تو بھی اس کو محبوب رکھ اور اس کو بھی محبوب رکھ جو
اس کو محبوب رکھے[2]

محبوبیت کا یہ عالم تھا کہ آنحضورؐ نماز پڑھتے ہوئے سجدے کی حالت میں
ہوتے اور یہ دونوں بھائی فرطِ محبت سے حضور کے کندھوں پر سوار ہو جاتے
تو حضورؐ اپنے سجدے کو طویل کر دیتے۔ کسی چیز کی فرمائش کرتے تو حضورؐ جب

---

[1] ذبح عظیم ۔ مصنفہ فوق بلگرامی ۔ صفحہ ۱۵

[2] ذبح عظیم ۔ مصنفہ فوق بلگرامی ۔ صفحہ ۱۸

تک ان کی فرمائش پوری نہ کر دیتے آپ کو چین نہ آتا تھا۔ کسی وجہ سے اگر ان دونوں میں سے کسی کے رونے کی آواز آتی تو بے قرار ہو جاتے۔ ایک بار ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے گھر سے نکل کر جناب فاطمہؓ کے دروازے پر سے گزرے تو حسینؓ کے رونے کی آواز آئی فوراً گھر میں داخل ہو کر فرمایا "فاطمہ! کیا تم نہیں جانتیں کہ اس کے رونے سے میرا دل دکھتا ہے"

تواریخ و سِیَر میں متعدد مصدّقہ روایات اس امر پہ شاہد ہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ، سیدہ فاطمہؓ، امام حسنؓ اور امام حسینؓ کو اپنے اہل بیت کہا ہے۔ امّ المومنین حضرت امّ سلمہؓ کی روایت سے احادیث میں آیا ہے کہ "آیتِ تطہیر میرے گھر میں نازل ہوئی جس کا ترجمہ ہے کہ

سوا اس کے نہیں کہ ارادہ کرتا ہے اللہ کہ دور رکھے تم سے نجاست کو اے اہل بیت! اور پاک کر دے تم کو جو حق پاک کرنے کا ہے۔

میں دروازہ کے پاس بیٹھی ہوئی تھی اور گھر کے اندر رسول خداؐ اور علی مرتضےٰؓ، جناب سیدہؓ اور حسنینؓ تشریف رکھتے تھے۔ پس آنحضرتؐ نے ان لوگوں کو کپڑا اوڑھایا اور فرمایا" اے میرے پروردگار! یہ میرے اہل بیت ہیں اور میرے مددگار ہیں، ان کو نجاست سے دور رکھ اور ان کو ایسا پاک کر دے جیسا کہ پاک کرنے کا حق ہے [1]

چادر اوڑھانے کی نسبت سے انہی نفوسِ قدسیہ کو آلِ عبا کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

---

[1] ذبح عظیم۔ مصنفہ فوق بلگرامی۔ صفحہ ۱۸

اپنی شرافتِ نسبی اور رسول اکرمؐ کے فرزند دلبند ہونے پر خود امام عالی مقام بھی بجا طور پر فخر کا اظہار فرماتے تھے چنانچہ جب عشرہ محرم کے روز آپ نے اپنی مختصر سی جماعت کو یزیدی لشکر کے مقابلے میں صف آرا کیا تو اتمام حجت کے طور پر آپ نے جو تقریر فرمائی اس میں اپنے متعلق یہ الفاظ فرمائے:۔

لوگو! میرا حسب نسب یاد کرو۔ سوچو میں کون ہوں۔ پھر اپنے گریبانوں میں منہ ڈالو اور اپنے ضمیر کا محاسبہ کرو۔ خوب غور کرو کیا تمہارے لئے میرا قتل کرنا اور میری حرمت کا رشتہ توڑنا روا ہے؟ کیا میں تمہارے نبیؐ کی لڑکی کا بیٹا اور اس کے عم زاد کا بیٹا نہیں ہوں؟ کیا سیّد الشہدا حمزہؓ میرے باپ کے چچا نہیں تھے؟ کیا ذوالجناحین جعفر الطیار میرے چچا نہیں ہیں؟ کیا تم نے رسول اللہؐ کا یہ مشہور قول نہیں سنا جو آپ میرے اور میرے بھائی کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ سید شباب اہل الجنۃ یعنی جنت میں نوعمروں کے سردار۔ اگر میرا یہ بیان سچا ہے اور ضرور سچا ہے کیونکہ واللہ میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے لے کر آج تک کبھی جھوٹ نہیں بولا تو بتاؤ کیا تمہیں برہنہ تلواروں سے میرا استقبال کرنا چاہیئے؟[1]

لیکن صرف شرافتِ نسبی یا رسول کی فرزندی ہی جناب حسنینؓ کے لئے فخر و مباہات کا باعث نہ تھی۔ نہ محض رسول اکرمؐ انہیں صرف نواسے ہونے کے تعلق سے تمام دوسرے لوگوں سے زیادہ محبوب رکھتے تھے۔ بلکہ چشمِ نبوت جسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مستقبل کا مشاہدہ کرنے کی قوت بھی حاصل تھی، اس پر یہ چیز روز روشن کی طرح عیاں تھی کہ آپ کے یہ دونوں نواسے آگے چل

---

[1] شہادتِ حسین از مولانا ابوالکلام آزاد صفحہ ۴۰

کہ تاریخِ اسلام کی تشکیل میں اتنے اہم کردار ادا کریں گے کہ تاریخِ انسانی کے افق پر قیامت تک چاند اور سورج کی طرح روشن رہیں گے۔ معتبر روایات میں آیا ہے کہ رسولِ اکرمؐ حضرت امام حسنؓ کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ میرا یہ بیٹا سردار ہے اور اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ امت کے دو مخالف گروہوں میں صلح کرائے گا۔ آنحضرت کی یہ پیش گوئی اس وقت پوری ہوئی جب جناب حسنؓ نے امیر معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دست بردار ہو کر امت کے دو بڑے گروہوں کے درمیان جنگ و جدل کی آگ بجھا دی۔ سیدنا امام حسینؓ کی شہادت کے متعلق نہایت واضح ارشادات رسول اکرمؐ کی کئی احادیث میں موجود ہیں بلکہ بعض لوگوں کی تحریروں کے مطابق تو رسول پاکؐ نے امام حسینؓ کی پیدائش کے وقت ان کی آئندہ شہادت کے متعلق خبر دے دی تھی۔ ایران کے ایک مشہور معاصر اہل قلم جناب راہنما اپنی کتاب "زندگانی حسینؓ" میں لکھتے ہیں:۔

"محمد او را با دوست خود بالا گرفت و بالا برد و بہ پیشانیٔ او
بوسہ نہاد و در یک گوشِ او اذان گفت و در گوش دیگر اُو
تسبیح خدا را خواند و گفت، نفریں بر آں مردمی کہ تو را بکشند[1]

ایک اور روایت میں ہے کہ ایک بار جب ننھے حسینؓ نے اپنی والدہ مکرمہ سے شکایت کی کہ نانا جان نے حسنؓ کے چہرے اور آنکھوں پر بوسے دیئے لیکن میری آنکھوں اور چہرے کو چومنے کی بجائے گلے کو چوما تو سیدہ کے پوچھنے پر آنحضورؐ نے فرمایا" فاطمۂ من: امروز را تو می بینی و فردا را من"

امامِ عالی مقام کے لئے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی بے پناہ محبت محض گوشت پوست اور خون کے رشتے سے نہ تھی۔ ہر چند کہ یہ تعلق بھی محبت کی ایک

---

[1] زندگانی حسینؓ ۔ صفحہ ۱۸۹

وجہ ضرور تھا لیکن اس کا اصل سبب وہ عظیم الشان کام تھا جو اس سردارِ جنت کو اپنی عمر کے آخری دنوں میں سر انجام دینا تھا اور جو آنحضرتؐ کے ضمیرِ نبوت پر نہایت وضاحت کے ساتھ منعکس تھا۔ اس عظیم مقصد کی تکمیل کے لئے ان دونوں کی ابتدائی تربیت کا فریضہ خود رسولؐ پاک کو سونپا گیا اور آنحضورؐ اور آنحضورؐ کے بعد حضرت علیؓ کی تربیت ہی کا نتیجہ تھا کہ خانوادۂ رسول کے یہ دونوں ارکان راست بازی، خدا ترسی، امانت، دیانت، حمیت، سخاوت، شجاعت کے مثالی پیکر بنے۔ چنانچہ جب امام حسینؓ نے لشکرِ اعدا کے سامنے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ:-

"اگر یہ میرا بیان سچا ہے اور ضرور سچا ہے کیونکہ واللہ میں نے ہوش سنبھالنے سے لے کر آج تک کبھی جھوٹ نہیں بولا"

تو اس طرح انہوں نے اپنے مثالی کردار کے ایک پہلو کی ایک جھلک ہمیں دکھائی ہے۔

آپ کے مثالی کردار کی شہادت آپ کے دوستوں اور دشمنوں نے یکساں طور پر دی ہے۔ کربلا کے سفر میں کوفہ سے آنے والے چار سوار ان سے آکر ملے۔ ان سواروں میں سب سے آگے طرماح بن عدی اس مضمون کے اشعار پڑھتا چلا آرہا تھا:-

"اے میری اونٹنی میری ڈانٹ سے ڈر نہیں۔ طلوعِ فجر سے پہلے پہلے ہمت سے چل۔ اچھے مسافروں کو لے چل سب سے بہتر سفر پہ چل۔ یہاں تک کہ شریف النسب آدمی تک پہنچ جا۔

وہ عزت والا ہے۔ آزاد ہے۔ فراخ سینہ ہے۔ اللہ اسے سب سے اچھے کام کے لئے لایا ہے۔

خدا اسے ہمیشہ سلامت رکھے۔"

اور جب کربلا کے میدان میں بدبخت سنان بن انس نے شہیدِ کربلا کا سر تن سے جدا کیا تو کٹے ہوئے سر کو خولی بن یزید اصبحی کے حوالے کرنے کے بعد دوڑا ہوا عمرو بن سعد کے پاس خیمے کے سامنے جا پہنچا اور عالمِ وحشت میں چلا چلا کر کہنے لگا:۔

"مجھے چاندی سونے سے لاد دو۔ کیونکہ میں نے بہت محبوب بادشاہ کو قتل کیا ہے۔ میں نے اسے قتل کیا ہے جو انسانوں میں سب سے اچھا تھا اور جس کے ماں باپ نسب میں سب سے افضل تھے۔ اور وہ بھی اپنے نسب میں سب سے اچھا تھا۔"

سانحۂ کربلا کے مرکزی کردار سیّدنا امام حسینؓ کی شخصیت کا یہ ایک نہایت اجمالی خاکہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنے عظیم انسان کو جب اتنا بڑا سانحہ پیش آئے کہ اِن کے بھائی، اِن کے بھتیجے، ان کے بھانجے اور خود ان کے بیٹے جو تین دن کے پیاسے بھی تھے ایک ایک کر کے ان کے سامنے شہید کر دیئے جائیں تو انہیں میدانِ جنگ سے ان کی لاشیں اٹھا اٹھا کر لانی پڑیں اور ان کا معصوم بچہ جو پیاس سے جاں بلب ہو ان کے ہاتھوں میں ظالم دشمن کے ایک تیر کے ذریعے جام اجل نوش کرے اور آخر میں انہیں خود تنِ تنہا دشمن کے ایک پورے لشکر کے خلاف نبرد آزما ہو کر اپنی جان بھی جہان آفریں کے راستے میں نچھاور کرنی پڑے تو اس سانحہ کی لامحدود اہمیت سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ کربلا کا یہ سانحہ اپنے اسی مرکزی کردار کی وجہ سے دنیا کی تاریخ میں انتہائی اہم اور اپنی نوعیت کے واقعات میں اہم ترین شمار ہوتا ہے۔

سانحۂ کربلا کا واقعاتی پہلو

جہاں تک اس سانحے کے واقعات کا تعلق ہے مختلف کتابوں میں اِن کی تفصیلات نہایت وضاحت سے موجود ہیں۔ ایسی کتابوں کے علاوہ جن کی حیثیت تاریخی ہے بہت سے شعراء خصوصاً برصغیر ہند و پاکستان کے شعراء نے اپنے لکھے ہوئے طویل مرثیوں میں اس سانحہ کی ایسی تفصیلات قلمبند کی ہیں کہ حق و باطل کے اس عظیم رزمیے کی تمام جزئیات صفحات قرطاس پر محفوظ ہو گئی ہیں یہ درست ہے کہ ان شعراء نے اور بعض نثر نگاروں نے بھی اس محبت اور عقیدت کی بنا پر جو انہیں امام عالی مقام اور خانوادۂ رسول ؐ سے ہے اور اس نفرت کے واسطے سے جو انہیں خانوادۂ رسول ؐ کے دشمنوں سے ہے واقعات پر کہیں تحسین و آفرین کے پھولوں کے ڈھیر لگا دیئے اور کہیں نفرین اور لعن طعن کی راکھ کی تہیں جما دی ہیں تاہم پھولوں کے ان ڈھیروں اور راکھ کی ان تہوں کے نیچے واقعات کو اپنی اصلی شکل و صورت میں آسانی کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔ دنیا کی کسی جنگ کی ایسی تفصیلات قلم بند نہیں ہوئیں جن میں ایک ایک لڑنے والے، ایک ایک قتل کرنے اور ایک ایک قتل ہونے والے نے میدان جنگ میں جس انداز سے اپنا کردار نبھایا اس سے پڑھنے والوں کو پوری آگاہی ہو سکے۔ صرف کربلا کا واقعہ ہی ایک ایسا تاریخی سانحہ ہے کہ جس کے متعلق ہمیں ایسی تمام تفصیلات نہایت وضاحت سے ملتی ہیں۔

اب ہم واقعہ کے تیسرے پہلو کو لیتے ہیں یعنی یہ واقعہ کیوں پیش آیا۔ واقعہ کا یہ پہلو دوسرے دونو پہلوؤں سے زیادہ اہم بھی ہے کیونکہ اس سے ہمیں واقعات کے وجوہ و اسباب کا پتہ چلتا ہے اور ان وجوہ و اسباب کی بنا پر ہم

اس سانحہ کی اہمیت کو بھی بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جس زمانے میں اسلام کا ظہور ہوا وہ شخصی حکومتوں، اور مطلق العنان بادشاہوں کا زمانہ تھا۔ جمہوریت جس کے مفہوم اور عملی پہلوؤں سے اس زمانے کے لوگ بخوبی واقف ہیں اس زمانے میں ایک موہوم چیز تھی، ظہور اسلام سے پہلے جمہوریت کا تصور صرف قدیم یونان کی جمہوری شہری ریاستوں میں ملتا ہے، لیکن ان جمہوریتوں میں ہر شہر کا اپنا علیحدہ جمہوری نظام تھا ان جمہوریتوں کی حدود مختصر اور ذمہ داریاں محدود ہوتی تھیں اور اہم مسائل پر غور و فکر کے لئے تمام لوگ شہر کے بڑے چوک میں جمع ہو کر اپنی رائے دینے کے مجاز تھے۔ اس طرح ہر شہری امور ریاست کی سرانجام دہی میں براہ راست شریک ہوا کرتا تھا۔ گویا ریاست اور عوام دونوں ایک ہی چیز تھے اور دونوں کے درمیان کسی طرح کا حجاب حائل نہ تھا۔

اس قسم کے جمہوری نظام کا قیام چھوٹی چھوٹی شہری ریاستوں میں تو ممکن تھا لیکن بڑے ملکوں میں قطعی طور پر ناقابل عمل تھا۔ لہذا قدیم یونانی شہری ریاستوں کا تجربہ دوسرے ممالک میں دہرایا نہ جا سکا اور تمام بڑی بڑی مملکتوں بلکہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بھی مطلق العنان بادشاہتیں قائم ہو گئیں۔ مختلف ممالک میں جو مذہبی رہنما آگے آتے ان میں سے بعض نے ان مطلق العنان بادشاہتوں کی تائید کی اور اس تائید کے بل بوتے پر بادشاہوں نے اس سیاسی فلسفے کی تبلیغ کرائی جسے بادشاہوں کے حقِ آسمانی (DIVINE RIGHT OF KINGS) کا نام دیا جاتا ہے۔

یہ ایک بڑی تاریخی حقیقت ہے کہ تاریخِ بنی نوع انسان میں انسانی اخوت جمہوریت اور مساوات کے واضح اور پاکیزہ تصورات سب سے پہلے ہمارے آقائے

نامدار سیدنا و مولانا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمائے اور نہ صرف ایک ایسے مکمل جمہوری نظام کا نظریہ متعارف کرایا جس میں ملکی معاملات عوام کے نمائندوں کی باہمی مشاورت سے طے ہوں، بلکہ مدینہ طیبہ میں عملی طور پر ایک مثالی جمہوری نظام قائم کرکے اس زمانے کے شاہ پسند معاشروں کے علمبرداروں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا یہ بات اس دور کے لوگوں کے ذہنوں سے بہت بالا تھی کہ حکومت کا کاروبار کسی آمرِ مطلق کے بغیر چل سکتا ہے۔ انہیں اسلام کے نظام مساوات پر بھی بڑا تعجب ہوتا تھا کیونکہ اس سے پہلے نہ تو ان کے مشاہدے میں آیا تھا نہ انہوں نے اپنے بزرگوں کی روایات میں کہیں یہ سنا تھا کہ کوئی ایسا معاشرہ وجود میں آ سکتا ہے جس میں تمیزِ بندہ و آقا مفقود ہو۔

قرآنِ حکیم جو انسانوں کی رہنمائی اور ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجا جانے والا آخری صحیفہ ہے۔ اس کائنات کی وہ اولین الہامی کتاب ہے جس میں شروع سے لے کر آخر تک "انما المومنون اخوۃ" کا درس رنگا رنگ پیرایوں میں دیا گیا ہے۔ اس کتابِ مقدس میں مومنین کی پہچان کا ایک معیار یہ بھی ہے کہ وہ اپنے معاملات حکومت سے باہمی مشاورتوں کے ذریعے طے کرتے ہیں "وامرہم شوریٰ بینہم" حتیٰ کہ رسول اکرمؐ صلی اللہ علیہ وسلم کو تاکید فرمائی گئی ہے کہ "شاورہم فی الامر" معاملات حکومت میں مسلمانوں سے ان کی رائے لیں اور ان کی رائے سے سیاسی پیچیدگیاں حل کریں۔ اس فرمان خداوندی میں بنیادی حکمت یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ میں جمہوری رائیں ہر سو بچھ جائیں ورنہ ظاہر ہے کہ تائیدِ وحی کی موجودگی میں رسول اکرم کی ذاتِ والاصفات کسی مشاورت کی محتاج نہ تھی اور صحابہ کرام کو حضورؐ کی ذات سے اتنی عقیدت تھی کہ وہ حضورؐ کے ہر حکم کی بے چون و چراں تعمیل کو اپنے لئے باعثِ سعادت خیال کرتے تھے۔

اسلامی نظامِ حکومت میں رخنہ اندازی

رسول اکرمؐ کے وصال کے بعد وہ جمہوری نظام جس کی بنیاد حضورؐ نے رکھی تھی، اپنی پوری انقلابی روح کے ساتھ جاری رہا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا انتخاب سراسر جمہوری اصولوں پر ہوا۔ اور رسول پاک کے اِن عالی مرتبت جانشینوں نے حکومت کے فرائض قرآن و سنت کی روشنی اور باہمی مشاورت کے اصول کے مطابق نہایت عمدگی سے سرانجام دیئے۔ البتہ حضرت عثمان غنیؓ کے عہدِ خلافت کے آخری سالوں میں رائے عامہ میں انتشار نمودار ہوا اور حالات اس درجہ ناخوش گوار شکل اختیار کر گئے کہ بعض فتنہ جو مدینہ پر چڑھ آئے اور شہادتِ عثمان کا المیہ پیش آیا۔

یہ تفصیل کا وقت نہیں ہے تاہم مؤرخ ابن عبدربہ نے جناب عثمانؓ غنی اور جناب عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے مابین جو جرح اپنی کتاب عقد الفرید میں درج کی ہے اور مسعودی اور دوسرے مؤرخین نے جو کچھ کہا ہے [۱] اس کی رُو سے امیر معاویہؓ کی حکومت کا معیار وہ نہ تھا جو جناب ابوبکرؓ اور جنابِ عمرؓ فاروق کے عمال کا انداز تھا۔

جنابِ امیر معاویہؓ نے حضرت عثمان غنیؓ کی نرم روی سے فائدہ اٹھا کر خود کو پورے شام کا حاکمِ مجاز بنا لیا تھا اور شام کی حکومت ان کے شخصی اقتدار کا مظہر بن گئی تھی۔ انہوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت سے انکار کیا اور اس

---

[۱] تفصیل کے لئے دیکھئے عقد الفرید، جز ۳ صہ ۲۸۷۔ مسعودی جز ۲۔ ص ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۳
نیز ابن کثیر جز ۷ ص ۲۱۵

نامۂ خلافت کی بھی پروا نہ کی جو خلیفۂ راشد نے اپنے جائز اختیارات استعمال کرکے ان کے نام بھیجا اور انہیں ان کے منصب سے معزول کر دیا تھا۔

مجھے جنابِ امیر معاویہؓ پر رد و قدح منظور نہیں ہے۔ میں تو صرف اس امر کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا انتخاب اسی طرح ہوا تھا جس طرح جنابِ ابو بکر صدیقؓ، جناب فاروقؓ اور جنابِ عثمان غنیؓ کا ہوا تھا۔

بلکہ صحیح بات تو یہ ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا انتخاب جناب عثمان غنیؓ کے چناؤ کی نسبت زیادہ جمہوری تھا۔ جناب عثمان غنیؓ کو تو اس ایک شخص نے امارت سونپی تھی جسے انتخابی بورڈ نے اپنے اختیارات تفویض کر دیئے تھے۔

اس کے برعکس جناب علی مرتضیٰؓ کو مدینہ کے عوام و خواص نے باقاعدہ ووٹنگ کرکے مسندِ خلافت سونپی تھی۔ کئی دن ووٹنگ ہوتی رہی تھی اور کوئی ایک فرد واحد ان کا چناؤ کرنے والا نہیں تھا۔ ان کا چناؤ کرنے والے سارے مدینہ کے وہ لوگ تھے جنہوں نے حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمان غنیؓ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔

مجھے ان لوگوں سے اختلاف ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ جنابِ علیؓ کا انتخاب آزادانہ اور جمہوری انتخاب نہ تھا اور بلوائیوں نے حضرت علیؓ کی بیعت جبراً لی تھی۔

یہ خیال تاریخ سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ حضرت علیؓ کی بیعت قطعی طور پر بیعتِ عامہ تھی بلکہ اس میں جناب علی مرتضیٰؓ کی خواہش کا کوئی عمل دخل نہ تھا۔ مدینہ کے عوام نے آپ اپنی مرضی سے ان کو خلیفہ کے طور پر چنا تھا اور

بہ اصرار انہیں خلافت پیش کی تھی۔ وہ تو اس وقت اپنی بجائے دوسرے اکابر اور خلافت کے اہل اصحاب کے ہاتھ پر بیعت کرنے پر بہ دل و جان راضی تھے مگر عوام کے نزدیک وہ باقی سب میں خلافت کے زیادہ اہل تھے۔

اور پھر یہی نہیں جنابِ علی مرتضیٰ کی خلافت کو اس وقت کی اسلامی دنیا نے بجز صوبہ شام کے اسی طرح قبولِ عام بخشا جس طرح حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمانؓ کی خلافت کو تسلیم کیا تھا۔

کاش امیر معاویہؓ جمہور مسلمانوں کی رائے کا احترام کرتے اور اسی طرح حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لیتے جس طرح حضرت علیؓ نے جناب عثمانؓ کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ اس وقت دے دیا تھا جب جناب عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے حضرت عثمانؓ کو خلافت سونپی اور ان سے بیعت کی تھی حالانکہ اس بیعت سے پہلے وہ اپنے آپ کو خلافت کا زیادہ اہل جانتے تھے اور وہ خلافت کے باقاعدہ امیدوار تھے۔

امیر معاویہ کی حیثیت یہ نہ تھی ۔امیر معاویہ اس بورڈ کے رکن نہ تھے جسے جنابِ عمر فاروقؓ نے اپنی شہادت کے وقت خلیفہ منتخب کرنے اور خلافت کا منصب پانے کا اہل ٹھہرایا تھا۔ اس بورڈ میں جو لوگ شریک تھے ان میں ایک جنابِ عبدالرحمٰنؓ بن عوف، دوسرے جناب سعدؓ بن ابن وقاص، تیسرے جناب زبیرؓ بن العوام، چوتھے جناب طلحہؓ، پانچویں جناب عثمانؓ غنی اور چھٹے حضرت علی کرم اللہ وجہہ تھے۔ ساتویں رکن اس بورڈ کے جناب عبداللہؓ بن عمرؓ تھے مگر انہیں خلافت پانے کا اہل نہیں بنایا گیا تھا۔ انہیں صرف خلیفہ منتخب کرنے کے لئے اپنی رائے دینے کا حق ملا تھا۔

خلافت پانے والے ان اکابر میں سے جنگِ صفین کے وقت صرف حضرت

سعدؓ، حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ اور حضرت علیؓ زندہ تھے۔ جناب عبدالرحمٰنؓ بن عوف جناب زبیرؓ، جناب طلحہؓ اور جناب عثمانؓ اس دنیا سے رحلت فرما چکے تھے اور جناب سعدؓ بن ابی وقاص اور جناب عبداللہؓ بن عمر حضرت علیؓ کو خلیفہ مان چکے تھے۔

جمہور مسلمانوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت پر اتفاق کیا ہے اور یہ اتفاق کیوں نہ ہوتا کہ جناب علی کرم اللہ وجہہ ہر اعتبار اور ہر لحاظ سے خلافت کے اہل تھے۔

وہ حضور پر اسلام لانے والے پہلے مقدسین میں سے ایک تھے اور مؤرخ الطبری کی رو سے تو وہ حضورؐ پر حضرت خدیجہؓ کے بعد سب سے پہلے اسلام لائے تھے اور حضورؐ کے ساتھ پہلی نماز پڑھی تھی۔ الطبری کے الفاظ ہیں:

اوّل من صلّی علیؓ ص[1]

الطبری نے جابر کی یہ روایت بھی اخراج کی ہے۔

بعثت رسول اللہ یوم الاثنین وصلی علی یوم الثلاثہ

رسول اللہ سوموار کے دن نبی بنائے گئے اور علیؓ نے منگل کے دن نماز پڑھی ص[2]

مؤرخ المسعودی کے نزدیک تو اکثر مؤرخین اور اصحاب حدیث کی رائے یہ تھی:۔

انہ لم یشرک باللہ شیئاً فیالف الاسلام بل کان تابعاً للنبی صلی اللہ علیہ وسلم فی جمیع افعالہ مقتدیاً بہ وبلغ ھو علی ذالک ص[3]

ص[1] الطبری جز ۲ ص ۳۱۲-۳۱۳ - ابن کثیر جز ۲ ص ۲۱ - ص[2] الطبری جز ۲ ص ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۴
ص[3] المسعودی جز ۲ ص ۲۸۳

کہ علیؓ نے اللہ کے ساتھ شرک کا گناہ بالکل نہیں کیا۔ وہ اسلام کے سوا کسی مسلک سے بالکل نا آشنا تھے۔

وہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر کام اور ہر طریق کی پیروی کرتے اور حضور صلعم کو اپنا پیشوا بناتے۔ اسی حال میں وہ بالغ ہوئے۔

بلوغ کے بعد بھی وہ حضورؐ ہی کے مسلک پر چلے اور کبھی کوئی بات حضورؐ کے مسلک کے خلاف نہ کی۔

ہجرت کی کٹھن گھڑی وہ حضورؐ کے بستر پر حضورؐ کی چادر اوڑھ کر سوئے کہ حضورؐ اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جائیں اور حضورؐ کے بستر پر اٹھنے والی مخالف نگاہیں حضورؐ کے بستر کو خالی پاکر حضورؐ کی عدم موجودگی کا احساس نہ کر سکیں۔

حضورؐ حضرت علیؓ کو بے حد پسند کرتے تھے۔ ان کو اپنے بیٹے کی طرح عزیز جانتے تھے اور ان سے اپنی بیٹی حضرت فاطمہؓ کو بیاہ دیا تھا۔

گو یہ وقت جناب علی کرم اللہ وجہہ کی خوبیوں کے شمار کا نہیں ہے۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ اپنی حسنات اور صلاحیتوں کے باعث خلافت پانے کی پوری صلاحیتیں ان میں موجود تھیں۔

جناب امیر معاویہ تو کسی بھی اعتبار سے ان کے مدِ مقابل بننے کے اہل نہیں تھے۔ وقت نے اور حالات نے بلاشبہ انہیں شام کی امارت کی مسند پر بٹھا دیا تھا کہ وہ اپنے بھائی یزید بن ابی سفیان کی اچانک وفات کی گھڑی اپنے بھائی کے پاس تھے[1]

اور ان کے اس بھائی نے انہیں مرتے وقت اپنی ماتحت فوج کا سربراہ بنا دیا تھا اور جناب عمر فاروقؓ نے مکہ کے مسلمان سپاہیوں کی تالیفِ قلب کے سبب ان کی امارت قبول کر لی تھی اور انہیں ان کے منصب سے نہ ہٹایا تھا۔ لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ امیر معاویہ حضرت عمر فاروقؓ

---

[1] الطبری جزء ۵۔ باب وبا عمواس

کے معتمدین میں سے نہ تھے۔

ان کا شمار ان عمال میں نہ تھا جن پر حضرت عمر فاروقؓ بھروسہ کرتے تھے۔ بلکہ حضرت عمر فاروقؓ نے تو انہیں معزول کرنے کی ٹھان لی تھی لیکن جناب عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے ان کی سفارش کی اور حضرت عمر فاروقؓ کو احساس دلایا تھا کہ اگر انہوں نے امیر معاویہ کو دمشق کی محافظ فوج کی سرداری سے ہٹا دیا تو مسلمین مکہ بددل ہو جائیں گے اور جناب عمر فاروقؓ، جو عوامی زلیست میں ہر عوامی گروہ کے جذبات کا احترام کرنا ضروری سمجھتے تھے اپنے ارادہ سے باز آگئے اور شہادت کے وقت تک ان سے ان کا منصب نہ چھینا۔

اس کے باوجود وہ انہیں پسند نہ کرتے تھے اور وہ ان کے معتمدین میں شامل نہ ہو سکے تھے۔ اس کے برعکس جناب علی مرتضیٰؓ حضرت عمر فاروقؓ کے اس قدر معتمد تھے کہ حضرت عمر فاروقؓ جب بھی ریاست کے دور دراز کے دورے پر روانہ ہوئے تو انہیں اپنا نائب السلطنت بنا کر گئے۔ ان کے سوا انہوں نے کبھی کسی دوسرے کو اپنی نیابت نہ سونپی۔

وہ ان سے ہر بات میں مشورہ کرتے اور ان کے ہر مشورے پر عمل کرتے اور پھر اس کے ساتھ ساتھ جناب علی مرتضیٰ نے مسندِ خلافت کو پا لینے کے بعد امر خلافت کو جس طرح نباہا وہ بالکل فاروقی مسلک تھا۔ بلکہ تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت عمرؓ کا یہ مسلک تو حقیقت میں خود جناب علیؓ کے مشوروں کا مرہون تھا۔ "اگر علیؓ نہ ہوتے تو عمرؓ ہلاک ہو جاتا" کا قولِ فاروقی خود اس پر شاہد عادل ہے۔ اسی لئے جناب علیؓ نے بھی اپنے فرائض کو بالکل ویسے ہی ادا کیا جس طرح عمر فاروقؓ نے کیا تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کو ویسی ہی سہولتیں بہم پہنچائی تھیں جیسی حضرت عمر فاروقؓ نے بہم پہنچائی تھیں۔

وہ خشک کھانا کھاتے، کوتاہ لباس پہنتے غریب سے غریب عرب دیہاتی کے لباس میں خود کو ملبوس رکھتے۔ ریاست کے خزانہ میں سے اپنے اوپر کچھ خرچ نہ کرتے۔

وہ راہ بھٹکے ہوئے مسافروں کو راستہ دکھاتے۔ وہ کمزوروں کی مدد کرتے۔

انہوں نے مسعودی کے الفاظ میں:

لم یلبس علیہ السّلام فی ایامہ ثوبًا جدیدًا
کبھی اپنے پورے عہد خلافت میں کوئی نیا کپڑا اپنے جسم پر نہ پہنا۔
وہ صرف دو درہم روزانہ خزانہ سے لیتے اور اسی میں اپنی بسر اوقات کرتے[1]
مورخ ابن کثیر کا بیان ہے کہ ایک بار حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کے سامنے جناب علیؓ کا ذکر آیا تو انہوں نے قسم کھا کر شہادت دی :
واللّٰہ إنہ ازھد الناس
بخدا علیؓ ساری دنیا کے لوگوں کی نسبت زیادہ پرہیزگار تھے[2]
اور یہ نہیں کہ جناب امیر معاویہ کو حضرت علیؓ کی ان حسنات کا علم نہ تھا۔ ان کے دربار میں حاضر ہونے والے کئی سفیروں نے جن میں سے ایک مشہور سردار اور معتبر مسلمان ضرار بن حمزہ بھی تھے، قسم کھا کر امیر معاویہ کو بتایا تھا۔
یعجبہ من الطعام ما خشن ومن اللباس ما قصر وکان واللّٰہ یجیبنا اذا دعوناہ ویعطینا اذا سالناہ ویعظم اھل الدین ویرحم المساکین ویطعم فی المغبۃ یتیمًا ذا مقربۃ ومسکینًا ذا متربۃ یکسو العریان وینہ اللعمان ویتوحش من الدنیا وزھرتھا[3]
انہیں سوکھی روٹی پسند آتی ہے اور مختصر اور کوتاہ لباس اچھا لگتا ہے۔ خدا گواہ ہے کہ ہم جب ان کو پکارتے ہیں تو وہ ہماری آواز کو سنتے ہماری باتوں کو مانتے ہیں۔ جب ہم ان سے کچھ مانگتے ہیں تو وہ ہماری مانگ پوری کرتے ہیں۔
ان کے نزدیک دینداروں کی بڑی منزلت ہے۔ وہ مسکینوں اور عاجزوں پر بڑے مہربان ہیں۔ وہ بھوکوں کو بھوک کے وقت کھانا کھلاتے ہیں۔ وہ یتیموں کو خواہ وہ رشتہ دار ہوں یا رشتہ دار نہ ہوں دور کے لوگ ہوں رزق مہیا کرتے ہیں وہ ننگے کو لباس عطا کرتے ہیں

---

[1] المسعودی جز ۲ ص ۲۴۱ [2] ابن کثیر جز ۸ ص ۵ [3] المسعودی جز ۲ ص ۴۲۲

اس کا ننگ ڈھانک دیتے ہیں اور کمزوروں اور لاچار انسانوں کا سہارا بنتے ہیں۔ انہیں دنیا اور اس کی زینتوں سے سخت نفرت ہے۔[1]

اور سچ جانیئے تو اسلام اسی لئے دنیا میں آیا تھا۔ اس نے سیاسی حکمرانی کی بنیاد اس لئے رکھی تھی کہ انسانی معاشرہ سے بھوک ننگ اور عاجزی و لاچاری ناپید ہو جائے۔ حضور بادی اسلامؐ جب تک اس دنیا سے رخصت نہ ہوئے، ان کی ساری توجہ اسی شئے پر مبذول رہی۔ اور انہوں نے عوام الناس کی ضرورتوں کو اپنی ضرورتوں پر ترجیح دی۔ خود روکھا سوکھا کھایا۔ کوتاہ لباس پہنا۔ بھوکے رہے مگر عوام الناس کی بھوک اور ننگ دور کرنے کے لئے ہر وہ کام کیا جو ان کے بس میں تھا۔

یہی کچھ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ نے اپنے مبارک مختصر عہد میں کیا۔ یہی کچھ جناب عمر فاروقؓ اپنے زمانے میں کرتے رہے تھے۔ یہی سُنتِ نبوی، یہی مسلکِ صدیقی اور روشِ فاروقی تھی اور اسے ہی اسلام نے اپنے سیاسی غلبہ کی اساس و بنیاد بنایا تھا۔

اسلام کے مجاہدین نے اپنی جانیں اور اپنے مال اس لئے اسلام کو سونپے تھے کہ اس دنیا میں ایک ایسا معاشرہ اور سیاسی جمہوری نظام وجود میں آئے جس میں کوئی کسی کا استحصال نہ کر سکے اور کوئی بڑے سے بڑا آدمی عوامی زلیست کو نظر انداز نہ کرنے پائے۔

جناب علی مرتضیٰ روکھی سوکھی کھاتے۔ بے رنگ کمبل کا لباس پہنتے کچے اور زمین دوز حجروں میں رہائش رکھتے۔ مزدوروں کی شکل وصورت میں بازاروں میں گھومتے تو صرف اس لئے گھومتے تھے کہ لوگوں کو ان کے طریق کار پر چلنے کی ترغیب ہو اور لوگ یہ جانیں کہ اسلام کے نزدیک حکومت کی مسند پر متمکن ہونے والے اصحاب کے فرائض کیا ہیں اور میں تو سمجھتا ہوں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے خلافت کی چادر اپنے کندھوں پر اوڑھتے ہی امیر معاویہ اور دوسرے اُموی حکام کی معزولی کے فرمان صرف اسی لئے جاری فرمائے تھے کہ جناب علی مرتضیٰؓ کو یہ اچھی طرح یقین ہو چکا تھا کہ جناب امیر معاویہ اور ان کے ساتھی اسلامی معاشرہ میں زہر گھول رہے تھے اور ان کے سبب وہ معاشی مساوات ختم

---

[1] مسعودی جزء۲ ص ۴۳۲

ہوتی جارہی تھی جس کے لئے اسلام آیا تھا۔

اسلام امیروں کو ریشم و کمخواب کے لباس پہنانے اور انہیں محلات مہیا کرنے کے لئے نہیں، عوامی زلیست کی تشنگیوں اور محرومیوں کو ختم کرنے آیا تھا۔ امویوں نے یہ تشنگیاں اور محرومیاں پھر سے معاشرہ کے مزاج میں جبراً داخل کر دی تھیں۔ حضرت ابوذر غفاریؓ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں اسی لئے شام گئے تھے کہ وہ ان اُمویوں کی پیدا کی ہوئی معاشی ناہمواریوں کے خلاف احتجاج کریں اور انہیں شام سے جس طرح نکلنا پڑا تھا وہ بھی جناب علی مرتضےٰ کے سامنے تھا۔ کوئی یہ بات مانے یا نہ مانے میرا تو ایمان ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے آپ کو حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد مسند خلافت کا امین صرف اسی خاطر بنایا تھا کہ وہ سمجھتے تھے کہ حضرت عثمانؓ کی خواہشات کے علی الرغم اُموی عُمّال ریاست نے جو معاشی بے چینی اسلامی معاشرہ میں روشناس کرادی تھی اسے دُور کریں اور یہ اسوقت تک ممکن نہ تھا جب تک زمامِ کار سیدنا علیؓ جیسے خلیفۂ راشد کے ہاتھ میں نہ آجاتی۔

یہی وجہ ہے جیسا کہ مورخ الطبری، ابن کثیر، ابن اثیر اور ابن خلدون کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ جب مسند نشین خلافت ہوئے اور جناب عبداللہ بن عباسؓ نے ان کو رائے دی تھی کہ امیر معاویہ کو خط لکھیں کہ آپ نے انہیں ان کی امارت پر قائم رکھا ہے۔ آپ ان کو یقین دلائیں کہ ان سے ان کی امارت چھینی نہ جائے گی تو جناب علیؓ نے حضرت ابن عباسؓ کی بات نہ مانی تھی اور فرمایا تھا:

"معاویہ میرے عامل نہیں بن سکتے اور میں انہیں شام میں امارت نہیں دے سکتا۔"

اور امیر معاویہ تو امیر معاویہ تھے حضرت علیؓ نے تو خود جناب ابن عباسؓ کو اس وقت سخت سزا دی تھی جبکہ انہیں پتہ چلا تھا کہ جناب ابن عباسؓ نے بصرہ کے عوامی خزانہ کو اپنی ذات پر خرچ کرنا شروع کر دیا ہے۔

مورخ الطبری اور مورخ ابن عبدربہ نے اس سلسلہ میں وہ مکتوب نقل کیا ہے جو جناب علی مرتضیٰؓ نے اپنے اس چچیرے بھائی جناب عبداللہ کے نام تحریر کیا تھا۔ اس کے الفاظ تھے:

قد اسخطت اللہ و اخربت امانتک و عصبت امامک وخنت المسلمین انک خربت الارض واکلت ماتحت یدک فارفع الی حسابک واعلم ان حساب اللہ اعظم من حساب الناس۔ والسّلام۔

تو نے اللہ کو ناراض کر دیا ہے اور اپنی دیانت مجروح کر دی ہے۔ تو نے اپنے امام کی نافرمانی کی ہے۔ تو نے مسلمانوں کے مال کو اپنے اوپر حلال کیا ہے۔

گویا تو نے دنیا میں فساد و بربادی روشناس کرادی ہے اور اس چیز کو ٹھونس گئے ہو جو تمہارے پاس تھی۔ میرے پاس حساب پیش کرو اور جان لو کہ اللہ کے پاس حساب دینا بندوں کے پاس حساب دینے سے زیادہ سخت ہے۔"

اس مکتوب گرامی کے الفاظ پر غور فرمایئے گا۔ یہ کس قدر سخت الفاظ ہیں اور ان کا مخاطب وہ شخص ہے جو ان کا دستِ راست اور ان کا چچیرا محبوب بھائی ہے۔

انہوں نے جب یہ خط لکھا تو انہیں یہ بھی احساس تھا کہ انہوں نے ابنِ عباسؓ کے ساتھ سختی کی ہے۔ اسی لئے انہوں نے ان کو لکھا کہ:

"اگر میرا بیٹا حسنؓ اور میرا بیٹا حسینؓ بھی یہی کچھ کرتے تو میں ان کو بھی سزا دیتا اور ان کا بھی مواخذہ کرتا۔"[1]

جب صورت حال یہ تھی کہ جناب علیؓ مرتضیٰ اپنے چچیرے بھائی ابن عباسؓ اور اپنے بیٹوں کو مسلمانوں کے مال کھانے کی اجازت نہ دے سکے تھے۔ جب وہ ان کو مسلمانوں کے مال کھانے کے جرم میں معزول کر سکتے تھے تو امیر معاویہ کو انہوں نے خلافت کی مسند پر بیٹھتے ہی معزولی کا جو فرمان لکھا تو اس پر تعجب کیوں کیا جائے۔ یہی تو اسلام تھا۔ یہی تو اسلام کی حکمتِ عملی تھی۔

اُموی امراء کا طرز حیات جو بھی ہو لیکن یہ احکام جاری کرنے والے حضرت علی کرم اللہ وجہہ ریاست کے خزانہ میں سے اپنی ذات پر دو درہم روزانہ خرچ کرتے تھے۔ سردی میں ایک کمبل نما جبّہ

---

[1] عقد الفرید جز ۲ ص ۱۲۲

اور گرمی میں ایک کھردرا لباس ریاست کے خزانے سے اپنے لئے نکالیتے۔

یہ لباس پھٹتا تو اس پر پیوند لگا لیتے۔ کرتے کے دامن گھس جاتے تو انہیں کاٹ دیتے۔ اور کرتا اونچا کر لیتے۔ کفیں پھٹ جاتیں تو انہیں کہنیوں تک کاٹ دیتے۔

وہ جو لباس پہن کر بازاروں میں نکلتے اسے دیکھ کر اجنبی انہیں مزدور سمجھ کر ان کو کہتے:

"ہمارا بوجھ اٹھاؤ اے مزدور" اور وہ اسے اٹھا لیتے۔

کیوں کہ انہوں نے پوری ملت کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ وہ امیر معاویہ اور ان جیسوں سے صرف اس لئے لڑتے تھے کہ ان کے نزدیک امیر معاویہ ملت کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہ تھے۔

اور میں جو علی علیہ السلام کے اسلام، اسلام سے ان کے خلوص اور ان کی بے پناہ عقیدت کے سبب ان کا ادنیٰ غلام ہوں، یہ پورا پورا یقین رکھتا ہوں اور اس یقین کی روشنی کو عام کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ علی علیہ السلام نے امیر معاویہ کے خلاف اس غرض سے معرکہ آرائی کی تھی کہ امیر معاویہ کی روشِ حکمرانی خلافتِ اسلام کے مطابق نہ تھی۔

بلاشبہ اس معرکہ آرائی میں بڑی خون ریزی ہوئی تھی۔ کئی فتنوں نے مثلاً فتنہ خوارج نے جنم لے لیا تھا مگر وہ حق پر تھے اور حق بالکل ننگی تلوار ہے یہ اندھیرے اور باطل سے مصالحت نہیں کر سکتا اور یہ میرا ہی نظریہ نہیں فاضلِ جلیل مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے بھی اپنی کتاب "حضرت امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی" میں اسی نقطہ نظر کا اظہار کیا ہے۔ مولانا مرحوم نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے وہ بلاشبہ حرفِ آخر کا درجہ رکھتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"خدا جانے لوگ کس طرح سوچتے ہیں۔ میرا تو حال یہ ہے کہ حضرت امام نے جیسے یہ فرمایا کہ اہل بغاوت سے جنگ کے قوانین کی تعلیم حضرت علیؓ نے ہی دی۔ اسی کے ساتھ میں یہ کہتا ہوں کہ حکومت کے جس نظام کو اسلام نے پیش کیا ہے، اس میں شک نہیں کہ خلفائے راشدین میں سے ہر ایک نے اپنے عملی نمونوں سے اس نظام پر عمل کر کے دکھایا ہے، لیکن یہ بات کہ اپنے اس نظام کے قائم کرنے پر اسلام کو اتنا اصرار ہے کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے مسلمانوں کا خون پانی سے زیادہ ارزاں نظر آنے لگے۔

لیکن ہر قیمت پر اس نظام کے قائم کرنے کی کوشش میں مسلمانوں کو آخر وقت تک منہمک رہنا چاہیئے۔
اسلامی نظام ریاست میں اتنی اہمیت صرف حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عملی نمونے نے پیدا کردی ہے
اس ریاست میں ادنیٰ سے ادنیٰ چشم پوشی یا مسامحت سے اگر وہ کام لیتے تو شاید نتیجہ نکالنے والے بعد
کو نتیجہ نکال لینے کا اس کو بہانہ بنا لیتے کہ حکومت کے جس معیار کو خلفائے راشدین نے دنیا میں قائم
کرکے دکھایا تھی تو وہ ایک معیاری حکومت لیکن اس میں ان بزرگوں کی ذاتی نیک نفسیوں کو دخل تھا خواہ مخواہ
حکومت کے اسی قالب پر اصرار کرنے کی ضرورت مسلمانوں کو نہیں ہے۔ جیسا کہ ایک بڑا گروہ خواہ
زبان سے اس کا اظہار کرتا ہو یا نہ کرتا ہو لیکن دل میں شاید یہی سمجھتا رہا یا ممکن ہے اب بھی سمجھتا ہو
لیکن صرف حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا طفیل ہے کہ عمل کرکے انہوں نے جو کچھ دکھایا یا زبان سے
جو کچھ فرمایا وہ تو خیر اپنی جگہ پر ہے اور اس میں ان کی ذات تنہا نہیں ہے لیکن حکومت کے اس نظام
کو جو بدلنا چاہتے تھے ان کے مقابلہ میں ہر قسم کی مصلحت اندیشیوں سے بے پروا ہو کر آستینیں
چڑھائے سر بکف میدان میں کود جانا اور اس طور پر کود جانا کہ بولنے والے تو صرف زبان سے بولتے
ہیں کہ ہم اپنے نصب العین کے لیے خون کا آخری قطرہ بھی بہانے کے لئے تیار ہیں لیکن جمل و صفین
میں یہ کرکے دکھا دیا گیا کہ دس پانچ نہیں ہزار ہا ہزار بقول بعض لاکھوں تک نوبت قتل و شہید ہونے
والے مسلمانوں کی پہنچی چلی جاتی تھی۔ کشتوں کے واقعی پشتے لگتے چلے جاتے تھے۔ مسلمانوں کی لاشوں
کا پہاڑ جمع ہوتا چلا جا رہا تھا لیکن یہ حد تھی کسی نصب العین پر اصرار کی کہ کسی قسم کا کوئی حادثہ یا کوئی
مصلحت ان کو بال برابر بھی اس سے نہ ہٹا سکی۔ میں نہیں جانتا کہ کسی نصب العین کے حصول کی
کوشش میں اس کی نظیر انسانیت کی تاریخ پیش کرسکتی ہے۔ سب کچھ اسی راہ میں لٹا دیا گیا بلکہ
کربلا کے میدان میں تو اسی نصب العین کے پیچھے علیؑ کے گھرانے کا ایک ایک بچہ قربان ہو گیا۔ اور
اب سمجھ میں آتی ہے اہمیت اس سیاسی نظام کی جسے "اسلام" نے دنیا میں پیش کیا ہے۔ لوگوں نے
اس پر بعد کو عمل کیا یا نہیں، یہ الگ سوال ہے۔ لیکن جمل و صفین و کربلا کے خون سے جریدۂ روزگار
پر جس نہ ختم ہونے والے اصرار کا نقش دوام قائم ہو گیا ہے۔ کیا اس کو کوئی مٹا سکتا ہے؟ اور جب تک

یہ نقش قائم ہے اسلامی نظام سیاست کی اہمیت بہر حال دنیا میں قائم رہے گی۔

یقیناً بعض دوسرے لوگوں کی طرح میرا بھی جی چاہتا ہے کہ اے کاش ملت میں یہ خون ریزی نہ ہوئی ہوتی اور جنگ صفین اور اس کے بعد کے معرکے گرم نہ ہوتے ہوتے اور تاریخ اسلام کے دامن پر خونِ مسلم کے دھبے یوں نہ نمایاں ہوتے مگر ایسا کیسے ہوتا جبکہ امیر معاویہ شام کی حکومت سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہ تھے۔ اور ان کے خاندان کے دوسرے وہ لوگ جو شہادتِ عثمانؓ کے بعد اقتدار سے محروم ہو گئے تھے، انہیں ہر وقت اکساتے رہتے تھے کہ علیؓ کے سامنے سر نہ جھکائیں۔

مجھے امیر معاویہ کی دانائی، فہم و فراست اور دوسری خوبیوں کا اسی طرح احساس ہے جس طرح مورخ ابن عساکر اور المسعودی کو اعتراف تھا۔ وہ بڑے حلیم الطبع بڑے فیاض اور رحمدل تھے[1]۔ بلا شبہ جیسے کہ مورخ ابن خلدون کہتا ہے کہ ان کے زمانہ میں سلطنت کو بڑا استحکام ملا اور سرحدیں بہت مضبوط ہو گئی تھیں اور جمہور مسلمانوں نے ان کی حکومت کو تسلیم کر لیا تھا[2]۔

مگر بات اصول کی ہو رہی ہے۔ اصولی طور پر اسلام اس لیے اس دنیا میں مبعوث نہیں ہوا تھا کہ کسی شخص واحد، کسی ایک خاندان کی سیادت و حکمرانی کے نظام کی طرح ڈالے۔ اسلام تو ایک ایسی عوامی حکومت کے قیام کا داعی تھا جس میں کوئی ایک شخص، کوئی ایک خاندان مسند پر نہ بیٹھے اور حکومت کے سیاہ و سفید کا مالک نہ بنے۔ اسلام کے نزدیک تو شخص یا خاندانی حکومت کا بالکل کوئی جواز نہ تھا۔

اسلام کے نزدیک تو ہر اس شخص کو حکومت کرنے کا حق تھا جسے عوام آگے بڑھاتے اور انتخاب عامہ کے ذریعہ حکومت سونپتے۔ جس طرح انھوں نے پہلے جناب ابی بکر صدیقؓ پھر جناب عمر فاروقؓ اور جناب عثمانؓ اور آخر میں جناب علی مرتضےٰؓ کو سونپ دی تھی۔

میں جناب امیر معاویہؓ کو مسلمان سیاست دانوں کی صف اوّل میں شمار کرتا ہوں اور ان کا بہت مداح ہوں مگر اس بات سے کیا ہوتا ہے۔

---

[1] ابن عساکر ج ۱۰ ص ۲۰۲ [2] المسعودی ج ۲ ص ۱۲۱

اسلام تو بڑے سخت اصولوں کا مجموعہ ہے۔ یہ تو کانٹوں کی سیج ہے۔ اسلام تو فرد سے بڑی قربانیاں مانگتا ہے اور صرف ایسے فرد کو حکومت کا اہل جانتا ہے جو اپنی ذات کو عوامی وجود میں اس طرح ضم کر دے کہ اس کی انفرادیت اجتماعیت کی حریف نہ بن سکے۔

اسلام کے نزدیک تو مسلمان حاکم گڈریے اور راعی کی مانند ہے اور ہادیٔ اسلام علیہ التحیۃ والسلام فرماتے ہیں:

"کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ۔ نعم الشیئی الامارۃ لمن اخذھا بحقھا وبئس الشیئی الامارۃ لمن اخذھا بغیر حقھا وحلھا۔ تکون علیہ یوم القیامۃ حسرۃ وندامۃ[1] من ولی لنا شیأً فلم تکن لہ امراۃ فلتیزوج امراۃ ومن لم یکن لہ خادم فلیتخذ خادماً فمن اتخذ سوٰی ذالک کنز وایلاً جاء اللہ بہ یوم القیامۃ غالاً اوسارقاً۔[2]

تم میں سے ہر شخص اپنے ماتحت عملہ کا محاسب اور اس پر خدا کے ہاں جواب دہ ہے۔

حکومت و امارۃ اس شخص کے لیے اچھی ہے جس نے اسے استحقاق کی بنا پر حاصل کیا اور اس کے فرائض کو اچھی طرح بجالایا۔

لیکن یہ حکومت اس شخص کے لیے بُری ہے جس نے اسے بغیر استحقاق کے قبضہ میں کر لیا اور مناصبِ حکومت کی بجاآوری نہ کی۔

یہ حکومت اس شخص کے لیے قیامت کے دن حسرت و ندامت کا سبب بنے گی۔ جس شخص کو ہماری طرف سے حکومت و نیابت کا کام سونپا گیا تو اسے صرف اس بات کی اجازت ہے کہ اگر وہ شادی شدہ نہیں ہے تو عوامی خزانہ سے شادی کر سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کام کاج کے لیے کوئی مددگار نہیں ہے تو وہ یہ مددگار رکھ سکتا ہے۔ اس کے سوا اگر کسی حاکم نے ریاست کے

---

[1] کتاب الاموال ص ۴ [2] ایضاً کتاب الاموال ص ۲۶۶

خزانہ میں سے سونا چاندی یا اُونٹ لے لیے تو وہ قیامت کے دن اللہ کے
حضور چور اور غاصب کے طور پر حاضر کیا جائے گا۔

یہ نئی ریاست جو عرب میں اُبھری اور جس نے شام و عراق و مصر اور دُوسرے اکنافِ عالم کو اپنے پاؤں تلے بچھایا تھا اور جس کے لیے امیر معاویہ خلیفہ منتخب جناب علی مرتضےٰ سے برسرپیکار تھے، کوئی موروثی ریاست نہ تھی۔ یہ محمدؐ عربی صلی اللہ علیہ وسلم، یہ ابوبکر صدیقؓ، یہ عمر فاروقؓ اور ان کے احکام کی پیروی کر کے اکنافِ عالم پر چھا جانے والی اسلامی سپاہ کی بہادری و شجاعت کے سبب قائم ہوئی تھی اور اس کے تمام تر شرائط و فرائض وہی تھے جو حضورؐ اور حضورؐ کے جانشینوں نے مقرر کیے تھے اور ظاہر ہے کہ ان فرائض میں کمی بیشی کا کسی کو بھی کوئی حق نہ تھا۔

میرے نزدیک حضرت علی کرم اللہ وجہہ، امیر مُعاویہؓ کے خلاف جنگ کرنے میں قطعاً حق بجانب تھے۔ یُوں یہ الگ بات ہے کہ امیر مُعاویہ اور جناب علی کرم اللہ وجہہ کے مابین جو معرکہ آرائی ہوئی اس سے ملت کے مجموعی مقاصد پر بڑا بُرا اثر پڑا تھا اور ملت کا شیرازہ بُری طرح بکھر گیا تھا اور میں تو سمجھتا ہوں کہ حضرت علیؓ کی شہادت کا سانحہ فاجعہ بھی اسی لیے پیش آیا تھا کہ ان میں اور جناب امیر معاویہ میں جو لڑائیاں ہو رہی تھیں ان سے رائے عامہ سخت مشتعل ہو گئی تھی۔

میں جناب علی مرتضےٰ کی شہادت کے اسباب پر بحث نہیں کروں گا البتہ یہ ضرور عرض کروں گا کہ شہادت کے وقت جب لوگوں نے ان سے پُوچھا کہ کیا ہم آپ کے بعد آپ کے بیٹے حسنؓ کو آپ کا جانشین بنا دیں تو انھوں نے جو جواب دیا وہ خلافت کے لیے اسلام کے شرائط کے عین مطابق تھا۔ انھوں نے لوگوں سے کہا:

"میں اس بارے میں تمھیں کچھ نہیں کہوں گا کہ خلیفہ کا انتخاب تمھارا حق ہے۔ تم جو مناسب جانو وہی کرو۔"

جناب علی مرتضےٰ کا یہ طریقِ عمل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے مطابق تھا۔

حضورؐ نے بھی وصال کے وقت اپنے جانشین کے بارے میں مسلمانوں کو کوئی ہدایت نہیں دی تھی اور یہ کام ان کی مرضی پر چھوڑ دیا تھا کہ یہی جمہوری عمل تھا اور اسی جمہوری عمل کی ترویج کے لیے جناب علی مرتضےٰ نے امیر معاویہ اور دوسروں سے محاذ آرائی کی تھی۔

یہ الگ بات ہے کہ کوفیوں نے حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد ان کے بیٹے حضرت حسنؓ کے سوا کسی اور کو خلافت کا اہل نہ جانا اور انھوں نے حضرت حسنؓ کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کر لی اور اس طرح اپنا جمہوری حق استعمال کیا۔

میرے نزدیک ہی نہیں جمہور مسلمانوں کے نزدیک حضرت حسنؓ خلیفۂ منتخب تھے۔ خواہ ان کا یہ انتخاب اس وقت کی آدھی اسلامی دنیا نے کیا تھا اور شام و مصر اور ان کے ملحقات اس بیعت میں شریک نہیں ہوئے تھے اور تاریخ دانوں کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ شام و مصر اور ان کے ملحقات نے اس لیے اس بیعت میں شرکت نہیں کی تھی کہ ان علاقوں میں جناب امیر معاویہؓ نے اپنی شخصی حکومت قائم کر رکھی تھی اور یوں اسلامی قلمرو دو حاکموں میں بٹ گئی تھی۔ ایک حاکم بزورِ تلوار اور بزورِ سیاست بر سرِ مسند آئے تھے اور دوسرے بذریعہ انتخابِ عامہ اس منصب پر فائز ہوئے تھے۔

جناب امیر معاویہؓ اور جناب حسنؓ کے مابین حالات نے جو صورت اختیار کی میں اس کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ البتہ یہ اشارہ ضرور کروں گا کہ جناب امیر معاویہ کو جیسے ہی حضرت علیؓ کی شہادت اور امام حسنؑ کی مسند نشینی کی خبر ملی وہ اپنی فوجوں کو ہمراہ لے کر کوفہ کی طرف آئے تھے تاکہ امام حسنؓ اور ان کے متّبعین کو للکاریں۔

ان میں اور جناب حسنؓ کی فوجوں میں جو معرکہ ہوا وہ تاریخ کا ویسا ہی الم ناک معرکہ ہے جیسے کہ جنگِ صفین تھی۔ البتہ جنگِ صفین اور اس معرکہ میں یہ فرق ضرور تھا کہ جنگ صفین میں جناب علیؓ کا پلّہ بھاری تھا اور اس معرکہ میں جناب امیر معاویہ کو فتح نصیب ہوئی تھی اور نتیجہ یہ ہوا کہ جناب حسنؓ ا جناب امیر معاویہؓ کے حق میں دستبردار ہو گئے اور ان کے ہاتھ پر بیعت

کر لی اور حکومت انھیں سونپ دی۔

جب امام حسنؓ نے خلافت کا حق امیر معاویہ کو بخش دیا تو امت کے بعض برگزیدہ اشخاص نے بھی جو اس وقت تک بعیت سے انکاری تھے امیر معاویہ کے ہاتھ پر بعیت کر لی اور اس طرح امیر معاویہ بلا اختلاف عالمِ اسلام کے خلیفہ ہو گئے۔ سیدنا امام حسنؓ کا یہ کارنامہ تاریخِ اسلام کا ایک نہایت روشن ورق ہے۔ اس سے مسلمانوں کے دو گروہوں میں دس سال سے جو نزاع چلا آتا تھا وہ ختم ہو گیا۔ مسلمانوں کی وہ قوت جو ایک دوسرے کے خلاف استعمال ہو کر تباہ ہو رہی تھی مزید تباہی سے بچ گئی۔ منافقوں اور مسلم نما یہودیوں کی سازشیں اور ریشہ دوانیاں جو دس سال سے نشوونما پاتے ہوئے اب بہت مستحکم ہو چکی تھیں یکایک ختم ہو گئیں۔ مشرکین جو بڑے مزے سے مسلمانوں کی خانہ جنگیاں دیکھ رہے تھے ان کی امیدوں اور آرزوؤں پر اوس پڑ گئی۔ دس سال سے اسلامی فتوحات کا جو سلسلہ رک گیا تھا پھر چل نکلا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ پیش گوئی پوری ہوئی جو آپ نے امام حسنؓ کے حق میں فرمائی تھی کہ:

"میرا یہ بیٹا سردار ہے اور خدا تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کے دو گروہوں میں صلح کرائے گا۔"

جس اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے سیدنا امام حسنؓ نے ایثار سے کام لیا تھا اس اصول کو امیر معاویہ بھی پیشِ نظر رکھتے تو یہ چیز امت کے لیے بہت خیر و برکت کا موجب ہوتی، لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ امیر معاویہؓ نے اس اصول کو پیشِ نظر نہ رکھا اور انھوں نے وہ طریقہ اختیار کیا جو تعلیماتِ رسولؐ اور خلفائے راشدین کے طریقِ کار کے خلاف تھا۔ گو اس کے لیے انھوں نے وجہِ جواز پیدا کی اور اپنے صوبائی حکام کو ہدایات ارسال کیں کہ وہ اپنے خطبوں میں عوام کو آگاہ کریں کہ امیر المومنین کے پاس اس مضمون کی درخواستیں اور عرضداشتیں پے در پے پہنچ رہی ہیں کہ وہ اپنے جانشین کا تقرر اپنی ہی زندگی میں کر دیں

تاکہ جس طرح اس سے پہلے خلافت کے لیے مسلمانوں میں جھگڑے پیدا ہوتے رہے ہیں آئندہ نہ پیدا ہوں اور ان خانہ جنگیوں کا سدِ باب ہو جائے جو اس سے پہلے ہوتی رہی ہیں۔ لہٰذا امیر المومنین نے بڑے غور و خوض کے بعد اپنے بڑے بیٹے یزید کو اپنا جانشین بنایا ہے۔ لیکن یہ ایک سیاسی حربہ تھا جو امیر معاویہ نے اپنے بیٹے کو اپنا جانشین نامزد کرنے کے لیے استعمال کیا۔ اس امر کے امکانات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بہت سے لوگوں کی طرف سے اس مضمون کی گذارشات امیر معاویہ کے پاس پہنچی ہوں لیکن اس صورت میں امیر معاویہؓ کی ذمہ داری اور بڑھ گئی تھی۔ انھیں خلفائے راشدین کا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے تھا۔ وہ یا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرح ایسے شخص کو نامزد کرتے جو ان کی دانست میں سیاسی بصیرت اور تقویٰ میں سب سے آگے ہوتا یا وہ حضرت عمرؓ کی طرح بہترین لوگوں کی ایک مختصر سی جماعت نامزد کر دیتے جن میں سب سے زیادہ موزوں اور مستحق شخصیت کو منتخب کر لیا جاتا اور اس جماعت میں اپنے بیٹے کو شامل نہ کرتے اور فاروقِ اعظم کی طرح خلافت کا عہدہ اس کے لیے ممنوع قرار دے دیتے لیکن اپنے بیٹے کو نامزد کرنا اس راستے سے واضح طور پر انحراف تھا جو شارعِ اسلام اور ان کے جانشینوں نے اختیار کیا تھا۔

امیر معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کو اپنا جانشین مقرر کر کے خلافت کو ملوکیت بنا دیا، جبکہ اسلامی نظامِ حیات جمہوریت و مساواتِ انسانی کی بنیاد پر استوار ہوا تھا۔ اس نظام میں پیدائش کے اعتبار سے کسی شخص کو فضیلت نہ حاصل تھی کہ خلیفہ کے گھر پیدا ہونے والا بلا استحقاق خلیفہ بن جانے کا اہل سمجھا جاتا۔ پھر خود امیر معاویہ بھی جانتے تھے کہ کردار و اخلاق کے اعتبار سے ان کا بیٹا یزید ہرگز اس اعزاز کا مستحق نہ تھا کہ مسلمانوں کا حاکمِ اعلیٰ بن سکے اور اگر مروجہ طریقِ انتخاب پر عمل ہوتا تو اس کے خلیفہ بننے کا مطلق امکان نہ تھا۔ یزید کی جانشینی سے اسلامی معاشرہ میں جس المناک بدعت کا آغاز ہوا اس کے متعلق دورِ حاضر کے ایک عظیم المرتبت مصنف ڈاکٹر طٰہٰ حسین لکھتے ہیں کہ:

"اس طرح اسلام میں ایک ایسی بدعت جاری ہوگئی جس کو پہلے سے بہت بُرا خیال کیا گیا یعنی حکمرانی کو موروثی بنا دیا۔ اس بدعت کا انجام مسلمانوں کے حق میں کیسے ہولناک وبال کی شکل میں نکلا اور بادشاہوں نے ولی عہدی کے لیے کیسے کیسے حرام حلال کام کیے۔ کتنی خون ریزیاں کیں، کتنے حقوق پامال کیے اور قوم کی کیسی کیسی مصلحتوں کو خاک و خون میں ملا دیا۔ اس وراثت کو حاصل کرنے کے لیے بعض بزرگوں نے بعض شہزادوں کے لیے انھیں کے بھائیوں سے کیسی کیسی مکاریاں کیں، مکر و فریب کے کیسے کیسے جال بچھائے۔ قرآن و حدیث سے اس وراثت کا کہیں ثبوت نہیں، متقی مسلمانوں کے معمولات میں کہیں اس کا پتہ نہیں[1]۔"

ڈاکٹر طٰہٰ کی طرح دوسرے بڑے مورخین اور نقاد بھی یہی کچھ کہتے ہیں اور یہی وجہ تھی کہ جیسے ہی امیر معاویہؓ اس دنیا سے رخصت ہوئے اور اس بیعت کا رشتہ ٹوٹا تو امام حسین علیہ السلام نے یزید کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی اور اس کی حکمرانی کو وہ للکار بہم پہنچائی جو کربلا کے حادثہ پر منتج ہوئی۔

یہ للکار علیؑ کی للکار تھی۔ یہ للکار حق و صداقت کی للکار تھی اور یہ فریضۂ الٰہی تھا جس کی تکمیل حسین علیہ السلام نے کی تھی۔

[1] حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ۔ از ڈاکٹر طٰہٰ حسین۔ اردو ترجمہ صفحہ ۵۴۸

امیر معاویہؓ کی سیاست اور یزید کا کردار

موجودہ دور میں جہاں جدت پسندی اور روایت شکنی کے زعم میں کچھ لوگوں نے علم وادب کی دوسری اصناف میں دیرینہ اقدار کی شکست وریخت کی ہے وہاں بعض محققین نے تاریخی واقعات اور حقائق پر بھی آزادیٔ رائے کا حق استعمال کیا ہے۔ آزادیٔ رائے کے شوق میں کچھ مسلمان اہلِ قلم نے یزید ابنِ معاویہ کی گمراہی اور بے راہ روی کی پردہ پوشی کرتے ہوئے اُسے ایک قابل اور باتدبیر حاکم ثابت کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ حد یہ ہے کہ ایک صاحب نے تو اپنی ایک تصنیف میں یزید کی شخصیت کو بہت بلند اور ارفع بنا کر پیش کیا ہے اور پھر بعض سطح بین قسم کے حضرات نے اسے ایک شہرۂ آفاق تصنیف بھی قرار دیا ہے۔ اسی موضوع پر بعض دیگر صاحبان نے مختلف جرائد میں مضامین بھی سپردِ قلم کیے ہیں مگر مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میں ان فاضل "جریدہ نگاروں" اور اہلِ قلم کی "بیش قیمت تحقیق اور آراء" سے متفق نہیں ہو سکتا۔ یہ حضرات محبانِ اہلِ بیت کو تشیّع کا طعنہ دیتے ہیں مگر خود ان کی دُوربین نگاہوں سے یہ بات اوجھل ہو گئی ہے کہ اہلِ بیت اطہار سے "محبت" اگر شیعیت ہے تو ان سے "عداوت" کو اہلِ حق نے "خارجیت" بھی قرار دیا ہے۔ ان کی محبت میں غلو اگر جائز نہیں تو ان کی مخالفت بھی کہاں جائز ہے؟

جیسا کہ ہم پچھلے صفحات میں عرض کر چکے ہیں تاریخ اسلام کا ایک معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ خلفائے راشدین نے خلیفہ کے انتخاب میں بڑی احتیاط و حد درجہ تقویٰ کا ثبوت دیا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا وقتِ آخر آیا تو انھوں نے اپنے کسی عزیز کو نہیں حضرت عمر فاروقؓ کو نامزد

فرمایا اور لوگوں سے اس کی منظوری لی تو صاف کہا کہ اے لوگو! میں نے تم پر اپنے کسی عزیز کو خلیفہ مقرر نہیں کیا۔ ایک ایسے شخص کو مُقرر کیا ہے جو تم سب میں اس کے لیے موزوں اور اہل ہے۔ حضرت عمرؓ کا انتقال ہونے لگا تو بعض لوگوں نے انھیں حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کو بطورِ خلیفہ نامزد کرنے کا مشورہ دیا۔ یہ عبداللہؓ ابن عمرؓ علم دین اور تقویٰ میں جو مقام بلند رکھتے تھے تاریخِ اسلام اس کی شاہد عادل ہے۔ مگر حضرت عمرؓ نے مشورہ دینے والوں کو ڈانٹ دیا اور کہا کہ بنی عدی میں سے صرف ایک آدمی ہی اس بارِ گراں کو اُٹھانے کے لیے کافی تھا۔

حضرت عثمانؓ کو تو خیر اس سلسلے میں کسی وصیّت کا موقع نہیں ملا۔ حضرت علیؓ دنیا سے رُخصت ہونے لگے تو ان سے کہنے والوں نے کہا "کیا ہم حسنؓ کو اپنا خلیفہ بنا لیں"۔ امام حسن علم و تقویٰ کے اعتبار سے خلافت کے پُورے اہل تھے مگر حضرت علیؓ نے اپنے پیش رووں کی پیروی کرتے ہوئے حد درجہ حکمت و احتیاط سے کام لیا۔ فرمایا کہ چاہو تو بنا لو چاہو تو نہ بناؤ۔ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہتا کہ یہ تمھارا کام ہے، میرا نہیں۔

خلفائے راشدین کے اس طرزِ عمل پر غالی سے غالی دشمن بھی یہ اعتراض نہیں کر سکتا کہ انھوں نے خلافت کو اپنے خاندان میں منتقل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن افسوس کہ حضرت امیر معاویہ اپنے تمام تر اوصافِ حسنہ کے باوجود اس سلسلے میں لوگوں کے لیے موقعِ تہمت فراہم کر گئے۔ انھوں نے اپنے بیٹے کو اپنی زندگی ہی میں جانشین نامزد کر دیا اور اس کے لیے مختلف ذرائع و وسائل اختیار کر کے مسلمانوں سے بیعت لینے کی کوشش کی۔ بیٹا اہل اور مستحق خلافت ہوتا تب بھی تُہمت سے بچنے اور احتیاط کا مظاہرہ کرنے کے لیے سلامتی اسی میں تھی کہ وہ اصحاب الرائے اور وقت کے اتقیاء و صُلحا کو جمع کر کے ان سے خلیفہ مقرر کرنے کے سلسلے میں مشورہ لیتے اگر یزید خلافت کا صحیح حق دار تھا تو یہ لوگ بھی اسی کا نام پیش کرتے۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ کام بھی ہو جاتا اور حضرت معاویہ کا دامن بھی داغدار نہ ہوتا۔ مگر یہاں صورتِ حال یہ سامنے آتی ہے کہ بیٹا سراسر نااہل اور ناخلف ہے مگر اس کے باوجود

حضرت معاویہ اسے نامزد کرنے اور اس کے لیے بیعت لینے پر اصرار کرتے ہیں۔ یہ قیصر و کسریٰ کا طریقہ تو تھا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کا طریقہ نہ تھا۔ خلافت اسلام میں عامۃ المسلمین کی امانت تھی، یہ ورثہ اور جائداد بننے والی شے نہ تھی۔

خلافت کی ذمّہ داری اور یزید

یزید اسلام کی رُو سے نااہل اور ناخلف تھا کہ نہیں؟ اس سوال کا جواب اسلام اور تاریخ اسلام سے واقفیت رکھنے والا ایک عام پڑھا لکھا آدمی بھی دے سکتا ہے لیکن جیسا کہ اُوپر کہا جا چکا ہے کچھ اہلِ قلم نے یزید کی حمایت میں بھی قلم اٹھایا ہے۔ ان جلیل القدر محققین نے حمایتِ یزید میں جس طرح تاریخی حقائق کا مُنہ چڑایا ہے اس کے لیے کم سے کم مجھ عاجز کی زبان سے داد و تحسین کے کلمات نہیں نکل سکتے۔ میں مانتا ہوں کہ یزید کو "برائیوں کی پوٹ" بنا دینے کے لیے یار لوگوں نے طرح طرح کی لغو اور مہمل روایات بھی گھڑی ہیں۔ یہاں تک کہا گیا کہ وہ ولد الزنا تھا۔ اس نے اُم المومنین حضرت عائشہؓ کے نام پیغامِ نکاح بھیجا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن جس طرح یہ انتہا پسندی قابلِ مذمت ہے اسی طرح یہ جوشِ حمایت بھی قابلِ تعریف نہیں کہ جوابِ آں غزل کے طور پر یزید کو امیر المومنین حضرت یزید رضی اللہ تعالیٰ عنہ بنا دیا جائے اور صحابہ کرام کی جملہ نیکیاں اس کے نامۂ اعمال میں درج کر دی جائیں۔ ناظرین کرام میں سے کچھ لوگوں نے محمود احمد عباسی کی کتاب میں ابنِ کثیر کے حوالے سے یہ روایت پڑھی ہوگی تو ان پر یزید کے ایمان و اسلام کا سکّہ بیٹھ گیا ہوگا کہ:

> "اور یزید کی ذات میں قابلِ ستائش صفاتِ علم و کرم، فصاحت و شعر گوئی اور شجاعت و بہادری کی تھیں۔ نیز معاملاتِ حکومت میں عُمدہ رائے رکھتے تھے اور معاشرت کی خوبی و عُمدگی ان میں تھی۔"[1]

[1] البدایہ والنہایہ۔ بحوالہ خلافتِ معاویہ و یزید

مگر کاش کہ البدایہ والنہایہ میں ان سطروں کے فوراً بعد ابنِ کثیر کی درج شدہ یہ عبارت بھی ان کی نظر سے گزر سکتی کہ ؛

"اور اس کے ساتھ اس پر شہوت کا سخت غلبہ رہتا تھا۔ نیز بعض اوقات نمازیں بھی ترک کر دیتا تھا۔"[1]

عصرِ جدید کے اس "محقق" نے اپنی آرا میں وزن پیدا کرنے کے لیے شاہ ولی اللہ، امام ابن تیمیہ اور علامہ ابنِ خلدون کا جگہ جگہ حوالہ دیا ہے۔ بہتر ہوتا کہ وہ یزید کی صلاحیّت و صالحیت ثابت کرنے کے لیے بھی انہی اکابرِ اُمّت کی طرف رجوع کرتے۔ "خلافت معاویہ ویزید" کے مُصنّف مورخین میں ابنِ خلدون کے سب سے زیادہ مدّاح اور مُعترف ہیں۔ ان کے نزدیک علامہ ابنِ خلدون نے اپنے شہرہ آفاق مقدمہ تاریخ میں بعض مشہور وضعی روایات کو نقد و درایت کے معیار سے پرکھنے کی کوشش کی اور نام نہاد مُورخین کے بارے میں صاف کہا کہ تاریخ کو خرافات اور واہی روایات سے انھوں نے بھر ڈالا۔[2]

لیکن ان کے یہی ممدوح ابنِ خلدون اپنے شہرہ آفاق مُقدمہ میں لکھتے ہیں کہ:

"جہاں تک امام حسینؓ کے واقعہ کا تعلق ہے اس کی اصلیت یہ ہے کہ جب عوام پر یزید کا فسق و فجور ثابت ہو گیا تو اہلِ بیت سے محبّت رکھنے والوں نے انھیں کوفہ تشریف لانے کی دعوت دی۔"[3]

علاّمہ ابنِ خلدون کے بعد دوسرے نمبر پر صاحب "خلافت معاویہ ویزید" امام ابنِ تیمیہ کے قائل ہیں وہ ان کے افکار کو اپنی تائید میں بڑی شدّ و مد سے پیش کرتے ہیں۔ یہی امام ابن تیمیہ رقم طراز ہیں کہ ؛

"جاہل کہتے ہیں یزید اُمّت کے صالحین میں سے تھا اور امامِ عادل تھا حالانکہ

---

[1] ابن کثیر البدایہ والنہایہ جلد ۸ ص ۲۳
[2] خلافتِ معاویہ ویزید ص ۱۷
[3] مقدمہ ابن خلدون ص ۱۸۰

یہ صریحاً غلط ہے[1]"

تیسرا مرتبہ عباسی صاحب کے نزدیک حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کا ہے۔ان کی کتابوں سے بعض غلط سلط حوالے وہ بڑے دعوے کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔یہی شاہ ولی اللہ دہلوی اپنی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں :

"قرونِ فاضلہ بھی ایسے لوگوں سے خالی نہیں تھا جنھیں شرع کے اعتبار سے منافق اور فاسق وفاجر کہتے ہیں مثلاً حجاج ، یزید ابن معاویہ، مختار اور قریش کے چند چھوکرے جنھوں نے مسلمانوں کو ہلاکت میں ڈالا[2]"

اگر کوئی حقیقت پسند شخص یزید کو فاسق وفاجر لکھ دیتا ہے تو عباسی صاحب کی تحریروں سے متاثر ہونے والے لوگ خفگی ظاہر کرتے ہیں لیکن دیکھنا چاہیے کہ علامہ ابن خلدون، امام ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ دہلوی کے خلاف ایسے لوگ کیا برہمی دکھاتے ہیں۔

یزید کا فسق وفجور

یزید کے فسق و فجور کے ردّ (یا جواز؟) میں ہمارے کچھ "بزرگ" صحافیوں اور "جلیل القدر" اہلِ علم کو لے دے کر جو دلیل یاد آتی ہے وہ بخاری کی ایک حدیث ہے جس میں حضورؐ نے مومنین کے اس اوّلین لشکر کو جو قسطنطنیہ پر چڑھائی کرے گا، جنّت کی بشارت دی ہے۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ اس اوّلین لشکر کا سپہ سالار یزید تھا۔اس لیے اس کی مغفرت کا مسئلہ ایک طے شدہ مسئلہ ہے۔اس کے بعد اس کے مستحق جنت ہونے میں شک وشبہ کی گنجائش ہی کہاں باقی رہتی ہے ؟

میں یزید کے سپہ سالار ہونے کی روایت پر تو ابھی آگے چل کر کلام کروں گا۔یہاں اسے تھوڑی دیر کے لیے تسلیم کرتے ہوئے پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ کیا اس حدیث میں یہ بھی کہا گیا ہے

[1] الرصیت الکبریٰ ص ۱۰۱ [2] حجۃ البالغہ ج ۲ ص ۱۹۸

کہ اگرچہ اس لشکر میں شریک لوگ قسطنطنیہ سے واپس لوٹنے کے بعد اہلِ ایمان کے خون سے ہولی ہی کیوں نہ کھیلیں تب بھی ان کی نجات ہو کر رہے گی؟ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ:

"ماں کے قدموں کے نیچے جنّت ہے۔"

وہ کون سا شارح حدیث ہے جس نے یہ کہا ہو کہ عُمر بھر ماں کی خدمت کرنے والا جنّت کا مستحق ہے خواہ آخر میں جا کر وہ اپنے باپ ہی کو کیوں نہ قتل کر دے؟ اس طرح کے اچھے اعمال و افعال پر استحقاقِ جنّت واجب لیکن ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے بعد کی زندگی میں آدمی کسی ایسی بُرائی میں مُلوّث نہ ہو جس کا انجام آتشِ دوزخ ہے۔
یزید اگر سپہ سالار بننے کے بعد جنّت کا مستحق ہو گیا تھا تو حیف صد حیف کہ اس نعمتِ عظمیٰ کے پانے کے بعد بھی وہ اہلِ بیت اطہار کے خُونِ ناحق سے باز نہ آیا۔ اس کے دامن پر اس بشارت کے بعد بھی معصیت کے وہ چھینٹے پڑ گئے کہ جنھیں آبِ زمزم سے بھی صاف نہیں کیا جا سکتا۔
لیکن — اس سے بھی آگے بڑھ کر میں تو یہ عرض کرتا ہوں کہ یہ یزید کی سپہ سالاری کا قصہ ہی محض زیبِ داستان کے لیے ہے! جن محققین نے اس کی تراش خراش اور اس کی نوک پلک سنوارنے کا عظیم کارنامہ انجام دیا ہے، بنواُمیّہ کی بارگاہِ معدلت پناہ میں تو وہ ضرور سونے سے تُل گئے ہوں گے لیکن افسوس کہ تاریخ ان کے اس جھُوٹ کو زیادہ دیر تک اپنے سینے میں محفوظ نہ رکھ سکی۔ کچھ بے باک تاریخ نگار ایسے بھی تھے جنھوں نے بڑی بے دردی سے اس جھُوٹ کے پردے چاک کر دیے۔ انھوں نے دعویٰ کیا کہ اس لشکر کے سپہ سالار یزید ابن معاویہ نہیں، سفیان ابن عوف تھے۔ یزید کا سپہ سالارِ لشکر ہونا تو ایک طرف رہا وہ لشکر ہی میں شامل نہ تھا۔ اور عین اس وقت جبکہ مجاہدین میدانِ جہاد میں دادِ شجاعت دے رہے تھے وہ اپنے محلات میں بیٹھا اپنی محبوبہ کی شان میں قصیدے لکھ رہا تھا۔ لیجیے...

پر ہی وہ گر گیا کبوتر کا
جس میں نامہ بندھا تھا دلبر کا

ہو سکتا ہے کہ میری ان کھری کھری باتوں سے کچھ محققین یا اُن کے معتقدین ناراض ہو جائیں لیکن ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ بیان میرا نہیں اُن محققینِ کرام کے محبوب مؤرخ علامہ ابنِ خلدون کا ہے۔ حضرت علامہ لکھتے ہیں :

"۵۰ھ میں امیر معاویہ نے سفیان ابن عوف کی قیادت میں ایک لشکرِ جرّار روم کی طرف بھیجا۔ انھوں نے اپنے بیٹے یزید کو بھی اس لشکر میں شامل ہونے کی ہدایت کی مگر اس نے اس لشکر میں شرکت کرنا پسند نہ کیا اور معذرت کر دی چنانچہ امیر معاویہ نے اس کی معذرت قبول کر لی۔ اتّفاق کی بات کہ اس جہاد میں مجاہدین نے بڑی مُصیبتیں اٹھائیں۔ رسد کی کمی اور امراض کی کثرت سے بڑی جانیں ضائع ہوئیں۔ جب یزید کو اس واقعہ کی اطّلاع ہُوئی تو اس کی زبان پر بے ساختہ یہ اشعار جاری ہو گئے۔

"میں اس کی قطعاً پروا نہیں کرتا کہ ان کی فوجوں کو فرقدونہ میں مصائب اور بدبختی سے دوچار ہونا پڑا۔ میں تو بلند ہو کر رنگ رنگ کے تکیے لگاتے اور دیرِ مران میں ام کلثوم میرے پہلو میں تھی۔"[1]

[1] تاریخ ابن خلدون ۳ ص ۹-۱۰

حضرت اِمام حسینؓ کا موقف

یزید جیسے آدمی کی نامزدگی کے بعد حضرت اِمام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے تین راستے تھے۔ ایک یہ کہ آپ اس بدعت کو تسلیم کرتے ہوئے بیعت کریں۔ دوسرے یہ کہ اعلان و اظہارِ حق کے لیے بیعت بھی نہ کریں اور حمایتِ یزید سے بھی علیٰحدہ رہیں اور تیسرے یہ کہ ایک منظم جدوجہد کے ذریعے یزیدی حکومت کا تختہ اُلٹ دیں۔ آپ نے اپنی خداداد فراست سے کام لیتے ہوئے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ پہلی بات آپ کے مرتبہ و مقام کے شایانِ شان نہ تھی۔ یہ صاحبِ عزیمت بھی اگر جبر و استبداد کے آگے ہتھیار ڈال کر عافیت کے دامن میں پناہ لے لیتا تو اُمت کے لیے قربانی و ایثار کی ایک غیر فانی داستان کیسے مرتب ہوتی۔ تیسرا راستہ امنِ عامہ اور مصالحِ اُمّت کے خلاف تھا۔ آپ ملّتِ اسلامیہ میں فساد اور خون ریزی کی بنیاد نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔ اس کے بعد ایک ہی راستہ باقی تھا اور وہ یہ کہ جابر سلطان کے خلاف کلمۂ حق کہیں اور اس کی حمایت سے بالکلیہ دست کش رہیں اور اعلان و اظہارِ حق کی پاداش میں جن مصیبتوں اور تکلیفوں سے دوچار ہونا پڑے، خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کریں۔ تاریخ گواہ ہے کہ آپ نے کامل آئین پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے اس درمیانی راستے کو اختیار کیا اور یہ وہ تدبیر تھی جو خروج و بغاوت سے کہیں بڑھ کر یزیدی حکومت کو تباہ و برباد کرنے میں کامیاب ثابت ہوئی۔

امام حسینؓ سے بیعت طلبی پر اصرار

حضرت امیر معاویہ جب تک زندہ رہے انھوں نے بیعت یزید کے لیے حضرت امام حسینؓ پر کوئی جبر نہیں کیا۔ دنیا سے رُخصت ہوتے تو اپنے بیٹے کو حسینؓ کے ساتھ حسنِ سلوک اور نرمی کی وصیت کر گئے مگر جونہی انھیں لحد میں اُتارا جا چکا حضرت حسینؓ سے بیعت لینے کی کوششیں تیز تر کر دی گئیں۔ یزید دانشمند ہوتا تو وہ آئین پسند حسینؓ سے بیعت لیے بغیر بھی حکومت کر سکتا تھا۔ آخر اس سے پہلے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ بھی تو یہ نمونہ پیش کر چکے تھے کہ جن لوگوں نے ان کے عہد خلافت میں اُن کی بیعت نہیں کی اور اُن کے خلاف صف آرا بھی نہیں ہوئے اُنھیں اپنے حال پر چھوڑ دیا اور ان سے زبردستی بیعت لینے کی کوشش نہیں کی۔ اِدھر حضرت امیر مُعاویہ کا انتقال ہوا اور اُدھر یزید نے حاکم مدینہ کے نام حسینؓ سے بیعت لینے کا فرمان جاری کر دیا۔ ولید (حاکم مدینہ) نے حضرت حسینؓ کو طلب کر کے بیعت کا مطالبہ کیا تو حسینؓ نے وہی جواب دیا جو اُن سے متوقع تھا کہا کہ "مجھ جیسا آدمی خُفیہ بیعت نہیں کر سکتا۔"

حضرت مُعاویہ کے اِنتقال کے بعد نئی حکومت ابھی پوری طرح قائم نہیں ہوئی تھی۔ حاکم مدینہ کے پاس نہ کوئی لشکر تھا نہ دوسرے ذرائع ووسائل۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت حسینؓ اس کے دفتر میں یہ جملہ کہہ کر آگئے اور وہ یزید کی واضح ہدایات کے باوجود کہ بیعت نہ کرنے کی صورت میں ان کے ساتھ سختی کی جائے، حضرت حسینؓ کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ آپ کا ارادہ خروج وبغاوت کا ہوتا تو اس کے لیے یہ سنہری موقع تھا۔ اہلِ مدینہ آپ کو سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ انھیں ساتھ ملا کر آپ آسانی سے مدینہ پر قبضہ جما سکتے تھے۔ مگر ہوتا کیا ہے۔ آپ مدینہ چھوڑ دیتے ہیں۔ مکہ پہنچتے ہیں کہ جو امن الناس کہلاتا ہے۔ جہاں اللہ کا وہ گھر موجود ہے جس میں مُجرم پناہ لے تو (فقہ حنفی کی رُو سے)

آج بھی اسے گرفتار نہیں کیا جا سکتا تاوقتیکہ ایسے حالات نہ پیدا ہو جائیں کہ وہ خود تنگ آ کر بیت اللہ سے باہر آ جائے۔ اور مکّہ کا یہ سفر بھی آپ کس لیے اختیار کرتے ہیں۔ کوئی فوج جمع کرنے کے لیے؟ یزید کے خلاف کسی جلسہ عام میں تقریر کرنے کے لیے؟ نہیں، صرف اس لیے کہ باطل کی حمایت کے لیے انھیں جس بُری طرح مجبور کیا جا رہا ہے اس سے اپنے آپ کو بچا سکیں، سلامت رکھ سکیں، امن و دوستی کا ثبوت بھی فراہم کر دیں اور حمایتِ باطل سے بھی بالکلیہ دست کش رہیں۔ ہمارے اس دعوے کا ثبوت آپ کے بھائی حضرت محمّد ابنِ حنفیہ کا وہ مشورہ ہے جو انھوں نے حاکمِ مدینہ کے ارادے ظاہر ہونے کے بعد حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پیش کیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا "زمانہ نازک ہے۔ امن و امان کہیں بھی نہیں۔ آپ مکّہ چلے جائیں اور اگر وہاں بھی یہ لوگ آپ کو آرام سے نہ بیٹھنے دیں تو آپ صحراؤں اور پہاڑوں کی راہ لیں اور جب تک ملک کی قسمت کا فیصلہ نہ ہو جائے اسی طرح جگہ جگہ منتقل ہوتے رہیں۔"[1]

اہلِ کوفہ کی طرف سے عرضداشتیں

آپ مکّہ پہنچتے ہیں مگر تاریخ کا کوئی طالب علم کسی معمولی سے معمولی مؤرخ کے حوالے سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ نے وہاں کوئی شورش پیدا کی، یزید کی حکومت کے خلاف کوئی سازش کی، اسلحہ جمع کیا یا لشکر ترتیب دیا۔ آپ وہاں امن و عافیت سے خلوت گزیں رہے۔ یہاں تک کہ اہلِ کوفہ کے لامتناہی نامہ و پیام کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اہلِ کوفہ نے اِتنے خطوط لکھے کہ ان سے پوری دو خورجینیں بھر گئیں۔ قاصد بھیجے۔ اجتماعی دستخطوں سے عرضداشتیں روانہ کیں جن کا مضمون یہ تھا:

---

[1] ابنِ اثیر ج ۴ ص ۸

"ہمارا کوئی امام نہیں۔ نعمان ابنِ بشیر (حاکم کوفہ) کے ساتھ ہم نماز نہیں پڑھتے۔ جمعہ و جماعت میں ہم شریک نہیں ہوتے۔ اگر آپ تشریف لے آئیں تو شاید حق پر ہم جمع ہو جائیں۔ ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ آپ تشریف لاتے ہیں تو نعمان ابنِ بشیر کو نکال باہر کریں اور اسے شام جانے پر مجبور کر دیں۔"

حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ پہلے تو اس خیال سے خاموش رہے کہ اُن کے اقدام کو حکومت غلط رنگ نہ دینے لگے۔ لیکن جب خطوط کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ گئی۔ قاصد آئے اور کوفہ کے انتشار انگیز حالات آپ کے سامنے پیش کیے تو آپ مصلح کی حیثیت سے ملّت کا افتراق و انتشار دور کرنے کے لیے کسی مناسب صورتِ عمل کے تعیّن کے لیے غور و خوض کرنے لگے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے تحقیقِ حال کا مرحلہ تھا آپ نے اس مقصد کے لیے اپنے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل کو کوفہ روانہ کیا کہ وہاں جا کر اصل صورتِ حال سے مطلع کریں۔ اس موقع پر حضرت حسین رضؓ نے اہلِ کوفہ کے نام حضرت مسلم رضی اللہ عنہ کے ہاتھ جو خط روانہ کیا عام طور پر مؤرخین نے اس کی اہمیت و معنویت کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اس خط میں حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہیں یہ نہیں لکھا کہ حضرت مسلم رضی اللہ عنہ آرہے ہیں۔ تم ان کی قیادت میں نعمان ابنِ بشیر کو نکال باہر کرو۔ یا نعمان ابنِ بشیر کے پیچھے جو تم نماز نہیں پڑھ رہے ہو بہت اچھا کر رہے ہو۔ وہ ایک "امام" کے طلب گار تھے اور اس ضمن میں بھی صاف صاف اپنے خط میں لکھ دیا کہ:

"الامام ھوالعامل بالکتاب والقائم بالقسط والداعی بدین الحق"

گویا دوسرے لفظوں میں اہل کوفہ کی یہ غلط فہمی رفع کرنے کی کوشش کی کہ امام و مصلح کے لیے تاج و تخت بھی ضروری ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ امام کی صفات تو یہ ہیں کہ وہ

کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرے، حق پر قائم رہے اور لوگوں کو حق کی طرف دعوت دے۔ اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ سریر آرائے حکومت بھی ہو اور اس کے ہاتھ میں قانون کی طاقت بھی ضرور ہو۔ مجھے تمہاری طرف سے دعوتِ امامت مل رہی ہے۔ میں اسے قبول کرنے کے لیے حاضر ہوں۔ مگر اس کے لیے تم نے یہ تصور قائم کر رکھا ہے کہ کوفہ کے حاکم کو نکال باہر کر دو اور عنانِ اقتدار میرے حوالے کر دو' اس کی چنداں ضرورت نہیں۔

حضرت امام حسینؓ کے لیے بیعت :

حضرت مسلمؓ کوفہ پہنچتے ہیں تو ایک غریب الدّیار مُسافر اور اجنبی کی حیثیت سے شہر میں داخل ہوتے ہیں۔ ان کا کوئی استقبال نہیں ہوتا۔ کوئی جلوس نہیں نکلتا۔ طالبانِ امامت کا ایک اجلاس منعقد ہوتا ہے۔ حضرت مسلم کے ہاتھ پر حضرت حسینؓ کے لیے اٹھارہ ہزار اور بعض روایات کے مطابق تیس ہزار کوفی بیعت کرتے ہیں۔ اتنی جمیعت نعمان ابن بشیر سے حکومت چھیننے کے لیے کافی سے زائد تھی۔ حضرت مسلمؓ کا ارادہ اقتدار حاصل کرنے کا ہوتا تو وہ آسانی سے کوفہ پر قبضہ کر سکتے تھے۔ مگر ان کی طرف سے اس طرح کی کوئی کوشش سامنے نہیں آئی۔ وہ اتنے امن پسند تھے کہ خود نعمان ابنِ بشیر اُن کے خلاف کارروائی کا مطالبہ کرنے والوں کو یہ جواب دے رہے ہیں کہ :

"لا اقاتل الامن قاتلنی ولا اشب الاعلی من وثب علیّ
ولا اخذ بالفرقة والظنة فمن ابدی صفحته نکث
بیعته اضربه ضربة بسیفی ماثبت قبضته فی یدی
ولو لم اکن الا وحدی"

مطلب یہ تھا کہ میں تو اس شخص سے لڑائی کرنے کو تیار ہوں جو مجھ سے لڑائی کرے اور اس پر حملہ کر سکتا ہوں جو مجھ پر حملہ کرے اور میں بدگمانی اور سوءِ ظن کے خیالات

پر عامل نہیں ہوا کرتا ہاں جو شخص بغاوت پر آمادہ ہو تو اس تلوار سے اس پر ضرب لگاؤں گا جب تک اس کا قبضہ میرے ہاتھ میں ہے۔ خواہ میں تنہا ہی کیوں نہ رہ جاؤں۔

بعض لوگوں نے بیعت لینے کو حضرت حسینؓ کی اقتدار طلبی کا ثبوت سمجھا ہے۔ غالباً ان محترم بزرگوں کی نظر سے یہ بات اوجھل ہو گئی کہ بیعت صرف حکومت ہی کے لیے نہیں لی جاتی۔ عرب میں تو یہ قاعدہ تھا کہ خرید و فروخت کرتے وقت کسی بات پر معاہدہ ہو جاتا تو ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیتے۔ یہ اس بات کی علامت ہوتی کہ معاہدہ طے ہو گیا اور اب اس کی خلاف ورزی نہیں ہو گی۔ یہی وجہ تھی کہ آہستہ آہستہ بیعت کا لفظ ہی بیع کے لیے بطور صفت استعمال ہونے لگا۔ خرید و فروخت کے علاوہ مرشد بھی اپنے مریدوں سے بیعت لیتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ مُرید اپنے مرشد کو ملک کا حاکم بنا رہا ہے۔ حضرت مُسلمؓ کے ہاتھ پر کوفیوں کی بیعت اس دوسرے معنی میں تھی۔ وہ حضرت مسلمؓ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر یہ عہد کر رہے تھے کہ ہم عامل بالکتاب امام حسینؓ کی تعلیمات پر ہر طرح عمل کرنے کو تیار ہیں اور ہماری اصلاح کے لیے وہ جو تدابیر بھی اختیار کریں ہم انھیں دل و جان سے قبول کریں گے۔

وہ لوگ جو امام حسینؓ کے کوفہ جانے اور حضرت مسلمؓ کو بطورِ نمائندہ وہاں بھیجنے کو کوفہ پر قبضہ جمانے کے عزائم سے تعبیر کرتے ہیں، وہ بھول جاتے ہیں کہ اس کوفہ کی حکومت کو حضرت مُعاویہ کے زمانے میں اہلِ بیت اطہار خود پائے اِستحقاق سے ٹھکرا چکے تھے کیونکہ اس کے لیے انھیں مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی و خون ریزی گوارہ نہیں تھی۔ حضرت حسنؓ نے صلح و امن کی فضا پیدا کرنے کے لیے عراق کی حکومت قربان کر دی اور تاریخ گواہ ہے کہ حضرت حسینؓ ان کے اس فیصلے پر شرح صدر کے ساتھ صاد کر چکے تھے۔ دس سال وہ حضرت امام حسنؓ کے ساتھ رہے اور اس صلح کا اُنھوں نے پورا پورا احترام کیا اور دس سال حضرت امام حسنؓ کے بعد حضرت مُعاویہ کے عہد

میں رہے اور ان سے کوئی امن شکن حرکت سرزد نہیں ہوئی۔ اب یہ کیسے مان لیا جائے کہ بیس سال قبل حسنؓ نے عراق کی جس حکومت کو خود چھوڑ دیا تھا اب حسینؓ بیس سال بعد خود اسے زیرِ نگیں لانے کی اسکیمیں سوچنے لگے تھے۔ اگر اس موقع پر کوفہ امام حسینؓ کو مل بھی جاتا تو نتیجہ کیا نکلتا یہی کہ شام یزید کے پاس رہتا، کوفہ حسینؓ کے پاس اور پھر غیر محدود مدّت تک ان دونوں علاقوں میں باہم آویزش ہوا کرتی اور مسلمانوں کا خون بہتا رہتا۔ عقل نہیں مانتی کہ جس مصلحتِ اُمّت کی خاطر یہ حکومت انھوں نے اتنا عرصہ پہلے چھوڑ دی تھی اب اس مصلحت کا خُون کرنے کے لیے وہ خود اس کے طلب گار بن جائیں۔ یہ حضرت امام حسینؓ پر سراسر اتّہام ہے۔ اصل بات یہ تھی کہ بیعت نہ کرنے کا اعلان کر کے تو انھوں نے اُمّت پر آزادیٔ اظہارِ رائے کی اہمیت ظاہر کی تھی اور کوفہ والوں سے بیعت لے کر ہمیں آزادیٔ اجتماع و تنظیم کا سبق دیا تھا۔ جمہوریت کے جو حقوق اہلِ مغرب کو آج معلوم ہوئے ہیں امام حسینؓ نے اپنے عمل سے وہ سینکڑوں سال قبل آشکار کر دیے۔

کوفہ کی طرف امام حسینؓ کی روانگی :

حضرت مسلمؓ کا خط موصول ہونے پر حضرت امام حسینؓ کوفہ سے روانہ ہوتے ہیں۔ خط میں اطلاع دی جا چکی تھی کہ آپ کے ہزاروں شیدائیوں نے میرے ہاتھ پر بیعت کی ہے۔ آپ کا ارادہ ان بیعت کنندگان کی مدد سے حکومت کا تختہ اُلٹنے کا ہوتا تو مدینے میں بھی آپ اس کا اظہار ضرور کرتے۔ تاکہ یہاں بھی آپ کے پرچم تلے ایک اچھّی خاصی تعداد جمع ہوتی۔ لیکن اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت امام حسینؓ اس طرح کی کوئی بات نہیں کرتے، نہ لشکر جمع کرتے ہیں، نہ اسلحۂ جنگ، چُپکے سے کوفہ سدھارتے ہیں اور اپنے امن دوست عزائم ظاہر کرنے کے لیے مزید احتیاط

یہ کرتے ہیں کہ اس سفر میں اپنے اہل و عیال کو بھی ساتھ لے لیتے ہیں تاکہ شبہ کرنے والوں کے لیے شبہ کرنے کی کوئی وجہ جواز باقی نہ رہے۔ اقبال مرحوم نے خوب کہا:

مدّعائش سلطنت بودے اگر
خود نکردے باچنیں ساماں سفر

اثنائے راہ میں ہیں کہ حضرت مسلم کی شہادت کی خبر ملتی ہے۔ جنگ کا ارادہ ہوتا تو آپ یہ خبرِ بد اپنے ساتھیوں سے چھپا لیتے کہ جنگی حکمتِ عملی کے نقطۂ نظر سے اس طرح ان کا مورال متاثر ہوتا۔ مگر آپ تو کھُلے کھُلے لفظوں میں اس کا اعلان کرتے ہیں اور اپنے ساتھیوں کو حکم دیتے ہیں کہ مصیبت و آزمائش کی اس گھڑی میں جو اُن سے علیٰحدہ ہونا چاہئے علیٰحدہ ہو جائے۔ مصیبت و آزمائش تو فقط ان کے تعاقب میں ہے کوفے کی طرف آپ بڑھتے ہیں۔ کوفیوں کی طرف سے دھوکے اور فریب کا مظاہرہ ہونے کے باوجود مقصود صرف تبلیغ حق تھا اور یہ فریضہ ان کے بیعت توڑنے کے بعد بھی ادا ہو سکتا تھا کہ دُور سے حُر کا لشکر نظر پڑا۔ آپ نے راستہ بدل دیا اور داہنی طرف زرحسم نامی پہاڑ کے دامن میں جاکر خیمے گاڑ دیے یہ آپ کی امن پسندی کا ایک اور درخشاں ثبوت تھا۔ نمازِ ظہر کے وقت آپ نے لشکریانِ حُر کے سامنے تقریر کی۔ فرمایا کہ:

"انی لم اتکم حتی انتنی کتبکم وقدمت علی رسلکم ان اقدم علینا فانہ لیس علینا امام لعل اللّٰہ ان یجمعنا بک علی ھدی فان کنتم علی ذالک فقد جئتکم فان اطعتم ما اطمن الیہ من عورکم موائیقکم اقدم مصرکم وان لم تفعلوکنتم لمقامی کارھین انصرفت عنکم الی المکان الذی اقبلت منہ الیکم"[1]

---

[1] ابنِ اثیر ج ۴ ص : ۳۴

"میں اس وقت تک تمہاری طرف نہیں آیا جب تک تمہارے خطوط اور قاصد میرے پاس نہیں پہنچ گئے کہ ہم امام کے بغیر ہیں۔ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے ذریعے ہمیں حق پر جمع کر دے۔ اگر اب تم اس موقف پر قائم ہو تو مجھ سے عہد کرو۔ تب میں تمہارے شہر جانے کو تیار ہوں اور اگر تم ایسا نہیں کرتے ہو اور میری آمد پر ناخوش ہو تو میں اسی طرف لوٹ جاؤں گا جہاں سے آیا ہوں۔"

حُر جواب دیتا ہے کہ :

"مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ مجھے تو یہ حکم دیا گیا ہے کہ آپ کو گھیر کر ابنِ زیاد کے پاس لے چلوں۔"

آپ اس ذلت کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ کوفہ وہ جانے نہیں دیتا۔ مدینہ جانے پر وہ راضی نہیں۔ آپ بیچ کی راہ نکال لیتے ہیں جو نہ کوفہ کو جاتی ہے نہ مدینہ کو۔ حُر رضامند ہو جاتا ہے۔ حسینیؓ قافلہ روانہ ہوتا ہے مگر کوئی منزل سامنے نہیں۔ ریت کے ذرّے بھی شاید اس وقت سر اُٹھا اُٹھا کر نواسۂ رسولؐ سے پوچھتے ہوں گے کہ:

منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی

چلتے چلتے ایک قاصد نظر پڑتا ہے یہ ابنِ زیاد کا قاصد تھا وہ پیغام لے کر آیا تھا کہ انھیں ایک بے آب و گیاہ علاقہ میں اترنے پر مجبور کر دو۔ آپ کہتے ہیں کہ ہمیں نینوا میں اُتر لینے دو۔ یا غاضریہ اور شفیہ میں۔ مگر حُر قاصد کی موجودگی میں سختی کرنے پر مجبور ہے۔ آپ کے ساتھی جوش میں آجاتے ہیں۔ کہتے ہیں یا ابن رسولؐ اللہ یہ لوگ کم ہیں ہمیں ان سے دو دو ہاتھ کر لینے دیجیے۔ بعد میں جو فوجیں آنے کو ہیں اُن سے نپٹنا آسان ہوگا مگر آپ فرماتے ہیں۔ " ماکنت لابدا ھم بالقتال" میں جنگ میں پہل نہیں کرنا چاہتا۔

یزیدی افواج کی آمد

اب عمرو بن سعد کی قیادت میں فوجوں کی آمد شروع ہوتی ہے۔ وادی سواروں اور پیادوں سے بھر جاتی ہے۔ دشمن آپ کو بے دست و پا بنا کر گرفتار کرنے یا بصورتِ دیگر آپ کی جان لینے پر تُلے ہوئے ہیں مگر یہاں بھی امام حسینؓ مصالحت اور امن پسندی کا دامن اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ وہ عمرو بن سعد کو گفت گو کی دعوت دیتے ہیں اور گفتگو میں یہ شرطیں پیش کرتے ہیں:

1 : میں جہاں سے آیا ہوں وہیں واپس لوٹ جانے دو۔
2 : مجھے سرحدوں پر چلے جانے دو کہ وہاں کُفار سے جہاد کرتا رہوں۔
3 : یا پھر مجھے یزید کے پاس لے چلو۔ میں اپنا معاملہ خود اس سے طے کر لوں گا۔

حافظ ذہبی، علامہ ابنِ حجر اور بعض دوسرے جلیل القدر مؤرخین نے اس تیسری شرط سے اختلاف کیا ہے۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ اگر یہ شرط صحیح بھی ہو تب بھی اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ حضرت امام خود یزید کے پاس جا کر کلمۂ حق کہنا چاہتے تھے۔ مقصد اس شرط کا ہرگز ہرگز یہ نہ تھا کہ وہ یزید کی بیعت پر آمادہ ہو چکے تھے۔

ان شرطوں کے پیش ہونے پر عمرو بن سعد کس طرح خوش ہُوا اور اُس کے بعد شمر ذی الجوشن نے بنا بنایا کام کس طرح بگاڑ دیا، یہ تفصیلات ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ ہم تو صرف حضرت امام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دامن سے الزامات کی گندگی دھونا اور یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ حضرت اِمام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ قدم قدم پر کس آئین دوستی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

اِتمامِ حُجّت

جنگ کی صُبح آپ پھر اتمامِ حجت کی آخری کوشش فرماتے ہیں۔ گھوڑے کی بجائے ناقہ پر سوار ہو کر (کہ گھوڑا جنگ کی اور ناقہ امن کی علامت ہے) میدان میں تشریف لاتے ہیں، کہتے ہیں کہ:

ایّها الناس اسمعوا قولی ولا تعجلونی حتی اعظمک بالحق لکم علیّ۔

"اے لوگو! میری بات سُنو اور جلدی نہ کرو۔ یہاں تک کہ میں تمہیں نصیحت کر لوں اس حق کے مُطابق جو تمہارا مجھ پر ہے۔"

پھر آپ اُن کے سامنے اپنا حسب و نسب پیش کرتے ہیں۔ ارشاداتِ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دُہراتے ہیں، اُن کے خطوط کا حوالہ دیتے ہیں۔ اُن سے سوال کرتے ہیں کہ:

"مجھے مطلع تو کرو میرے قتل کے درپے کیوں ہو؟ کیا مجھ سے کسی مقتول کا بدلہ چاہتے ہو یا اپنے کسی مال کا جو میں نے ضائع کر دیا ہے یا اپنے کسی زخم کا قصاص مانگتے ہو؟

ان باتوں کا جواب کون دیتا۔ سپاہِ یزید کا ایک آدمی پکار کر کہتا ہے:

"آپ یزید کی بیعت کیوں نہیں کرتے؟"

اس سے پہلے سوال قانون و آئین اور رواداری و صلح پسندی کا تھا تو حُسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ ابریشم کی طرح نرم تھے۔ اب بات حمایتِ باطل کی شروع ہوئی تو فولاد بن گئے۔ اللہ اکبر۔ کس ولولہ انگیز انداز میں جواب دیا:

لا واللہ لا اعطیھم بیدی عطا الذلیل ولا اقرارا بعبودیة عباداللہ انی عذت بربی وربکم ان ترجمون

اعوذ بربی وربکم من کل متکبر لا یومن بیوم الحساب۔
خدا کی قسم یہ نہیں ہو گا کہ میں اپنے آپ کو ذلت کے ساتھ اُن کے حوالے کر دوں اور بندوں کی بندگی کا اقرار کر لوں۔ میں اللہ سے پناہ مانگتا ہوں، اس بات کے لیے کہ میرا دامن داغدار ہو۔ میں پناہ مانگتا ہوں ہر اس متکبّر سے جو یومِ آخر پر ایمان نہیں رکھتا۔

اتمامِ حجّت کی تمام کوششیں بے کار گئیں۔ امن و مصلحت کے پیغامات کا جواب تیر اور تلوار سے دیا جانے لگا۔ اس جرم میں کہ حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک نامزد شدہ فاسق و فاجر نام نہاد خلیفہ کے آگے سر اطاعت خم کیوں نہیں کرتے۔ ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا۔ ظلم و تشدّد کا کون سا حربہ تھا جو نہیں آزمایا گیا۔ مگر زمانہ دیکھ رہا تھا کہ وہی حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو کل تک فساد اور خونریزی سے بچنے کے لیے ہر ممکن تدابیر اختیار کر رہا تھا حمایتِ باطل کے الزام سے بچنے کے لیے آج خون میں نہا رہا تھا۔ اس کی زبان پہ یہ شعر جاری تھا:

سامضی وما بالموت عار علی الفتی
اذا ما ترا حقا وجاھد مسلما

میں جاؤں گا اور ضرور جاؤں گا۔ جوان مرد کے لیے موت عار نہیں جبکہ وہ حق پر قائم ہو اور اسلام کے لیے جہاد کرے۔

یہ تھا واقعۂ کربلا کا ایک اجمالی خاکہ۔ اسے دیکھ کر آپ خود ہی فیصلہ کریں کہ حضرت امام حُسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ باغی تھے یا مُصلح۔ طلبِ اقتدار کے لیے کوشاں تھے یا داعی الی الحق۔ جن اہلِ قلم نے ان کے خلاف لکھا ہے وہ تاریخ کے چہرے پر کالک ملنا چاہتے ہیں تو شوق سے ملیں۔ حقائق کو مسخ کرنا چاہتے ہیں تو شوق سے یہ مشغلہ جاری رکھیں۔ قرطاس و قلم کی محفلیں سجتی ہی تب ہیں جب ایک نہ ایک ہنگامہ خیز

موضوع پیش نظر ہو۔ ہم تو سیدھے سادے مسلمان ہیں۔ جمہور اہلِ سنّت کے عقائد و نظریات کو برحق مانتے ہیں۔ امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہمارے نزدیک تو حمایتِ باطل سے علیٰحدگی اختیار کر کے، آزادیٔ اظہار رائے اور آزادی اجتماع و تنظیم کے سبق دے کر، حق بات پر سر کٹا کر ایثار و محبّت کی راہ میں روشنی کا ایک مینار قائم کر دیا۔ کوئی اس روشنی کو روشنی ماننے کے لیے تیار نہیں تو اپنی بصیرت و بصارت کی خیر منائے۔

حسینؓ —— ایک مظلوم ترین شخصیّت

مِلّتِ اسلامیہ نے جو عظیم شخصیات پیدا کی ہیں اُن میں ایک حضرت حسینؓ بھی ہیں۔ لیکن حسینؓ عظیم شخصیّت ہی نہیں دُوسری بے شمار شخصیّات کی طرح مظلُوم بھی ہیں۔ شاید مظلُوم ترین شخصیت۔ لیکن یہ مظلومی اس لیے نہیں کہ انہیں، ان کے جگر گوشوں اُن کے عزیز و اقارب اور اُن کے مُٹھی بھر ساتھیوں کو کربلا کے میدان میں بھوکا پیاسا شہید کر دیا گیا۔ یہ سانحہ اگرچہ بجائے خود المناک ہے کہ ایک شخص کو اس کے بچّوں، ساتھیوں اور عزیزوں سمیت مار ڈالا جائے لیکن جہاں تک فعلِ قتل کا تعلق ہے، ایسے سانحے دُنیا میں اکثر رونما ہوتے رہے ہیں۔ اس دُنیا میں انسان نے انسان پر بارہا ایسے ظلم و ستم ڈھائے ہیں کہ جن کے ذکر سے زہرہ آب ہو کر رہ جاتا ہے۔ انسانی تاریخ کے اوراق ان کی داستانوں سے بھرے پڑے ہیں۔ خود ہم مسلمانوں کی تاریخ کے ایسے لاتعداد ورق ہیں جو مظلومیت کے خون سے لالہ رنگ ہیں۔ انسانی نقطہ نظر سے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تیغِ ستم کا شکار ہونے والے عام انسان ہیں یا خانوادۂ نبوّت سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ کس حالت اور کیفیت میں قتل ہوئے ہیں۔ بے گناہوں کا قتل بہرحال ظلم ہے۔ چاہے یہ ظلم عام اشخاص کے ساتھ روا رکھا گیا ہو یا خواص کے ساتھ۔ پھر جو قتل مقتولین کے لیے سعادت و سربلندی اور ذبحِ عظیم کا باعث ہو وہ تو اپنے دامن میں رنج و غم سے زیادہ درس آموزی کا سامان رکھتا ہے اور حق و صدق کے علمبرداروں نے ان مدارج پر سرفراز ہونے کے

لیے ہمیشہ تمنّا کی ہے جن کا راستہ تلواروں اور دار و رسن کے سائے میں سے گزرتا ہے۔

امام حُسینؓ کی مظلومیّت کا حقیقی پہلو

حضرت حسینؓ ملّت کی مظلوم ترین شخصیت اس لیے ہیں کہ انھوں نے جس مقصد کے لیے اپنا اور اپنے جگرگوشوں، اپنے عزیز و اقارب اور اپنے مُٹھی بھر رفیقوں کا سر کٹوایا، اس مقصد کو ملّت نے یا تو سمجھا ہی نہیں اور سمجھا تو اسے تاریخ کی بھُول بھلیّوں میں گم کر دیا۔ بعض لوگوں کے نزدیک جنھیں حسینؓ اور اُن کے خانوادے کی محبّت اور اتباع کا دعویٰ ہے، کربلا کے سانحہ کا ظاہری پہلو ہی سب کچھ ہے۔ رہا مقصد تو وہ سمجھتے ہیں کہ حسینؓ اپنے باپؓ اور ناناﷺ کے تختِ اقتدار کو جس پر حریف قابض ہو گئے تھے دوبارہ حاصل کرنے اور حق بحقدار رسید کرنے کے لیے مدینۃ النّبی سے نکلے تھے کہ یزیدیوں کے عظیم لاؤ لشکر نے انھیں کربلا میں شہید کر ڈالا۔ قطع نظر اس کے کہ یہ مظلومانہ شہادت خود آپ کے حامیوں یعنی اہلِ کوفہ کی غدّاری کا نتیجہ تھی کہ انھوں نے خط پر خط لکھ کر انھیں مدینہ منوّرہ سے بلایا اور پھر عین وقت پر کوفہ کے گورنر کی دھمکیوں اور ترغیب و تحریص کا شکار ہو کر ان کو دغا دی۔ نہ صرف ساتھ چھوڑ دیا بلکہ شامی فوج میں شریک ہو کر اُن کے مُقابلے میں گئے اور اپنے ہاتھوں سے انھیں شہید کیا۔ یہ لوگ حضرت حسینؓ کا جو نقشہ دُنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں وہ خود ان کی اپنی نظر میں وقیع ہو تو ہو، اس کی نوعیّت ایک ایسے جاہ پسند شخص سے کچھ بھی مختلف نہیں جو اپنے جذبۂ جاہ پسندی کی تسکین کی خاطر نہ صرف اپنے آپ کو بلکہ اپنے بیٹوں اور بھتیجوں کو، اپنے قریبی رشتہ داروں اور گنتی کے چند جاں نثاروں کو وقت کی حکومت کے مقابلے میں لا کر ذبح کروا دیتا ہے۔ حضرت حسینؓ کی یہ تصویر

اس گروہ کے لیے چاہے کتنی ہی جاذبِ نظر اور دل کش ہو، خود ان کی عظمت اور اس عظیم الشان قربانی سے جو انھوں نے کربلا کے میدان میں دی کوئی میل نہیں کھاتی۔ حضرت حسینؓ اور ان کا خانوادہ اس امر سے بہت بلند ہے جو ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

کربلا کے سانحہ کے ظاہری المناک پہلو کو اہمیت دینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ سال میں صرف چند روز صفِ ماتم بچھا کر سمجھ لیا گیا کہ حسینؓ کی محبت کا تقاضا پورا ہو گیا ہے۔

دُوسرا اِنتہا پسند گروہ

اس گروہ کے اس طرزِ عمل کے ردِّ عمل میں ایک اور طرزِ فکر حال ہی میں اُبھرا ہے۔ اس طرزِ فکر کے حاملین کے نزدیک حضرت حسینؓ معاذ اللہ باغی اور سرکش تھے جنھوں نے ایک جائز حکومت کے خلاف عَلمِ بغاوت بلند کیا تھا چُنانچہ وہ اس کی پاداش میں قتل ہو گئے۔ جیسا کہ ہر باغی کا انجام ہوا کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ اتنے صاف اور صریح الفاظ میں یہ بات نہ کہتے ہوں مگر وہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے سانحے سے لے کر حادثۂ کربلا تک کے واقعات کو جس منظر و پس منظر کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور خلافتِ مُعاویہؓ ہی نہیں خلافتِ یزید کو بھی برحق ثابت کرنے کے لیے جس منطق سے کام لیتے ہیں اس کا نتیجہ یہی نکلتا ہے اور کہنے والا جو کچھ کہتا ہے، سمجھنے والا یہی سمجھتا ہے۔ بلاشبہ یہ ایک جدید طرزِ فکر ہے۔ ماضی میں مُعاویہؓ و علیؓ اور یزید و حُسینؓ کے مُناقشات میں اہلِ سُنّت کا یہ عقیدہ ہرگز نہیں رہا ہے جس کو اس طرزِ فکر کے حاملین اُچھال رہے ہیں۔ حضرت علیؓ کو اہلِ سُنّت نے

خلیفۂ راشد مانا ہے۔ ان کا اسمِ گرامی منبروں سے جمعہ اور عیدین کے خطبات میں پہلے تین خلفائے راشدین کے ساتھ پکارا گیا ہے۔ ان کے فیصلوں کو ابوبکرؓ و عمرؓ کے فیصلوں کی طرح فقہائے اُمّت نے نظیر مانا ہے۔ امیر مُعاویہ کے مُقابلے میں حضرت علیؓ کی حمایت کی ہے اور انھیں حق پر مانا ہے۔ اس کے برعکس امیر مُعاویہ کو نہ کسی نے خلیفۂ راشد مانا ہے اور نہ اسلامی تاریخ میں ان کو وہ مقام دیا گیا ہے جو خلفائے راشدین کو حاصل ہے۔ ان کے متعلق محتاط سے محتاط علمائے اہلِ سُنّت کا طرزِ عمل کف اللسان رہا ہے۔ یعنی انھوں نے خلیفۂ راشد حضرت علیؓ کے مقابلے میں یا اپنے بیٹے یزید کو اُمّت کے سر پر مسلّط کرنے میں جو روِش اختیار کی اس پر نکتہ چینی نہ کی جائے اس لیے کہ امیر مُعاویہؓ صحابیٔ رسُولؐ ہیں اور اس شرف کا تقاضا یہ ہے کہ خاموش رہا جائے۔ گویا جہاں تک حضرت علیؓ پر امیر مُعاویہ کو ترجیح دینے یا کم از کم انھیں اوّل الذکر کا ہمسر تسلیم کرنے کا تعلّق ہے، اُمّت میں یہ بالکل نئی بات ہے۔ یہی کیفیت یزید اور حسینؓ کے سلسلے میں ہے۔ اہلِ سُنّت کی نظر میں یزید کو کبھی وہ مُقام حاصل نہیں رہا ہے جو حضرت حسینؓ کو حاصل رہا ہے۔ یزید کے مقابلے میں انھوں نے حضرت حسینؓ ہی کو حق پر سمجھا۔ یزید کی حکومت کو انھوں نے خلافتِ راشدہ کی طرح کبھی مقدس نہیں گردانا ہے۔ اہلِ سُنّت کا اس بات پر بھی اتفاق رہا ہے کہ یزید کی تخت نشینی کا اس طرزِ حکومت سے کوئی تعلّق نہ تھا جو اسلام پیش کرتا ہے۔ اسلامی سیاست میں اس بدعت کے آغاز نے اُمّت کے مُستقبل کے سیاسی نقشے اور تاریخ کو یکسر بدل ڈالا۔ حضرت حسینؓ کی مظلُومی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک گروہ نے ان کی قربانی اور سرفروشی کو ماتم کی صفوں اور مجلس آرائیوں کا عنوان

بنادیا اور دوسرے گروہ نے انہیں ایک باغی اور سرکشی کی صف میں لاکھڑا کیا۔

یزید کے متعلق یہ بحث کہ وہ اخلاقی اور دینی لحاظ سے بلند تر شخصیت تھی یا پست تر۔ ہمارے نزدیک سراسر غیر متعلق ہے۔ یزید فرض کر لیجئے ائمہ تابعین میں سے تھا' زہد و تقویٰ کا پیکر تھا' اس کے دن اللہ کی راہ میں جہاد کرنے اور راتیں اس کے حضور میں رکوع و سجود میں گزرتی تھیں لیکن اصل سوال یہ ہے کہ وہ جس انداز میں امت کے سر پر مسلّط کیا گیا اور اس کی تخت نشینی سے جس طرز حکومت کی بنیاد پڑی اس کی حیثیت اسلام میں کیا تھی ؟

اسلام میں سیاست وحکومت کا تصوّر

یہ تو ظاہر ہے کہ اسلام سیاست و حکومت کا تصور بھی اپنے دامن میں رکھتا تھا۔ ورنہ دین تکمیل پذیر ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ بات تو ناقابل یقین ہے کہ اسلام زندگی کے تمام شعبوں میں تو رہنمائی کرتا ہے لیکن سیاست و حکومت کی رہنمائی کے بارے میں خموش تھا اور اس بات کو اس نے ہر اس طاقت ور شخص پر چھوڑ دیا تھا جو مسلمانوں کا سر اپنے آگے جھکوانے کی قوت رکھتا ہو۔ قرآن و حدیث اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اسلام نے جس طرح اجتماعی زندگی کے دوسرے پہلوؤں کے لئے ہدایات دی ہیں اسی طرح سیاست اور حکومت کے لئے بھی اصول دیئے ہیں۔ اس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ مسلمانوں کا نظام حکومت شورائی یا آج کی زبان میں جمہوری ہونا چاہیئے۔ البتہ سربراہ حکومت کے انتخاب کی کوئی واضح شکل متعین نہیں کی۔ اس کا سبب واضح تھا۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو شکل بھی متعین فرما دیتے وہ قیامت تک کے لئے لازمی قرار پاجاتی تھی۔

اس لیے صرف سیاست وحکومت کے اصول دے دینے ہی پر اکتفا کیا گیا. اور مملکت کے سربراہ کا طریقِ انتخاب ہر دور کے مسلمانوں پر چھوڑ دیا گیا کہ وہ ان اصولوں کی روشنی میں ہر عہد کے تقاضوں کے پیشِ نظر انتخابی ادارے قائم کر سکیں۔

خلیفہ کے انتخاب کے لیے اُصُول

ان اصولوں میں باپ کا بیٹے کو نامزد کرنے اور ایک ہی خاندان میں وراثت کے طور پر حکومت کا سلسلہ جاری رکھنے کی بہر حال کوئی ہدایت نہ تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر چاہتے تو وہ اپنے خاندان ہی کے کسی فرد کو اپنا جانشین نامزد فرما سکتے تھے۔ مگر ان کی جانب سے ایسے کسی اقدام کا فقدان خود ظاہر کرتا ہے کہ یزید جس طریقے سے مسلمانوں پر مسلط کیا گیا اسے کوئی شرعی جواز حاصل نہ تھا یہی نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خاندان کے کسی شخص کو نامزد نہیں فرمایا بلکہ کسی دوسرے فرد کو بھی نامزد نہیں فرمایا تاکہ کوئی شخص آئندہ چل کر اس فعلِ رسولؐ کو نظیر بنا کر عامۃ المسلمین کی رائے اور رضامندی حاصل کیے بغیر بالا ہی بالا ان پر مسلّط نہ ہو جائے۔

دوسرے الفاظ میں یہ بات مسلمانوں کی رائے عامہ پر چھوڑ دی کہ وہ اسلام کے عطا کردہ نظریۂ حکومت کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کس کو منتخب کرنا پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب عامۃ المسلمین ہی نے کیا۔ حضرت عمرؓ کو بظاہر حضرت ابو بکرؓ نے نامزد کیا لیکن درحقیقت عامۃ المسلمین کی رائے لے کر اور غالب ترین اکثریت کو ان کے حق میں پا کر کیا۔ حضرت عثمانؓ کا انتخاب عامۃ المسلمین کی رائے سے ہوا۔ حضرت علیؓ کو بھی عامۃ المسلمین ہی نے منتخب کیا۔ انھی عامۃ المسلمین

جنھوں نے ابوبکرؓ وعمرؓ اور عثمان رضی اللہ عنھم کو منتخب کیا تھا۔

یزید کی نامزدگی

لیکن یزید گزشتہ تمام روایات توڑ کر اور ابوبکرؓ وعمرؓ کی سنت کی خلاف ورزی کرتے ہوئے قیصر وکسریٰ کی سنت کے مطابق مسلمانوں پر مسلط ہوا۔ عامۃ المسلمین کی رائے کو اس میں کوئی دخل نہ تھا۔ امیر معاویہ نے جب پہلے پہل اکابر صحابہ سے یزید کے متعلق رائے لی تو انہوں نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی۔ چنانچہ گورنروں کے ذریعے عامۃ المسلمین کو مجبور کیا گیا کہ وہ یزید کی ولی عہدی کی بیعت لیں۔ اس طرح سربراہ مملکت کا جمہوری طریق انتخاب بدل کر ایک ایسا طریقہ رائج کر دیا گیا جس کا اسلام کے مزاج، اس کے احکام اور اس کی سیاست و حکومت کے نظریات اور اصولوں سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ خلفائے راشدین کے منہاج کے ترک کرنے اور اسلامی جمہوریت کو ملوکیت میں بدل ڈالنے سے پورا اسلامی تصورِ سیاست وحکومت متاثر ہوا۔ پہلی ضرب عامۃ المسلمین کے اس حقِ خلافت پر پڑی جو انہیں اللہ اور اس کے رسول نے مساوی طور پر دیا تھا اور جس کو وہ اپنی مرضی سے اپنے میں سے بہترین شخص کو سونپ دیتے تھے۔ اب اس حق کو ایک خاندان نے غصب کر لیا اور اس غصب نے مسلمانوں کی سیاسی تاریخ پر اتنا گہرا اور دور رس اثر ڈالا کہ آج جب کہ افریقہ کے ملکوں میں بھی جمہوریت اور شورائی طرزِ حکومت کو اختیار کیا جاتا ہے مسلمانوں پر ہر جگہ خاندانی بادشاہتیں اور جمہوریت کے نام پر شخصی آمریتیں ـــــ جو کسی وقت بھی خاندانی بادشاہتوں میں بدل سکتی ہیں ـــــ مسلط ہیں اور اگر کہیں جمہوری نظامِ حکومت قائم کرنے کی جدوجہد کی جاتی ہے تو یہ فلسفہ بگھارا جاتا ہے کہ جمہوریت مسلمانوں کے قومی

مزاج کے منافی ہے اور انہیں جمہوری نظام حکومت کی نہیں ایک ایسے نظامِ حکومت کی ضرورت ہے جو ان کے قومی مزاج کے موافق ہو، جسے وہ سمجھتے بھی ہوں اور چلا بھی سکتے ہوں۔

نظامِ حکومت میں تغیّر

نظامِ حکومت کی اس تبدیلی نے مسلمان معاشرے کے اخلاق، معاشرت افکار و عقائد غرض اس کی اجتماعی اور انفرادی زندگی پر تباہ کن اثر ڈالا۔ دین اور سیاست میں تفریق پیدا کردی۔ نسلی تعصبات کی راہیں کھول دیں۔ جن سے امت پارہ پارہ ہو گئی۔ بیت المال پر ایک خاندان اور اس کے ہوا خواہوں کا تصرف ہو گیا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جو پہلے اسلامی ریاست کا فریضہ ہی نہیں مقصدِ وجود سمجھا جاتا تھا، نسلی بادشاہت نے اس مقصدِ وجود سے سیاست کو محروم کردیا اب یہ محض انفرادی حدود ہی میں انجام دیا جاسکتا تھا اور اس کی پاداش میں بسا اوقات اہل حق کو قتل ہونا پڑتا تھا۔ غرض یزید کو مسلمانوں کی گردن پر مسلّط کر کے جس نظامِ حکومت کی بنیاد رکھی گئی وہی ان ساری برائیوں اور مفاسد کا منبع تھا جس میں امتِ مسلمہ ہر جگہ آج تک مبتلا چلی آئی ہے۔

حضرت حسینؓ جن کی دور بین نگاہ دیکھ رہی تھی کہ نظامِ حکومت کی یہ تبدیلی اسلامی نظامِ حکومت کا خاتمہ ہی نہیں ہے بلکہ یہ اپنے جلو میں مفاسد اور برائیوں کا ایک ہولناک سیلاب لے کر آئے گی۔ انہوں نے اس تبدیلی کے خلاف احتجاج کیا۔ اس کے آگے سر جھکانے سے انکار کر دیا۔ وہ مدینہ سے مکہ معظمہ پہنچے اور وہاں سے اپنے اہل وعیال کو لے کر کوفہ کی طرف روانہ ہوتے جہاں کے باشندوں نے انہیں بلا بھیجا تھا۔ حضرت حسینؓ کے پیش نظر کیا

پروگرام تھا اور وہ اس کو کس طرح جامہ عمل پہنانا چاہتے تھے، اس کا پتہ تو کوفہ پہنچنے پر چل سکتا تھا۔ لیکن ابھی راستے ہی میں تھے کہ کوفہ کے شیعانِ علی نے ان سے غداری کی اور وہ یزید کے گورنر ابن زیاد سے مل گئے اس طرح کوفہ پہنچنے اور کسی پروگرام پر عمل کرنے کی نوبت بھی نہ آپائی اور حادثہ کربلا رونما ہوگیا۔

یزید کی حکومت کی قانونی حیثیت

یزید کی حکومت کو قانونی ثابت کرنے کے لئے صحابہؓ کی ایک بڑی تعداد کا ذکر کرکے کہا جاتا ہے کہ کیا ان کی بیعت اس حکومت کو قانونی حکومت ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ اور کیا سارا عالم اسلام یزید کی سربراہی پر متفق نہیں ہوگیا تھا۔ پھر احادیثِ رسول سنائی جاتی ہیں جن میں حکومت وقت کے خلاف خروج کو ناجائز قرار دیا گیا ہے اور ہدایت کی گئی ہے کہ جب تک امیر نماز کے قیام کا حکم دیتا رہے اس کی اطاعت کرو اور سرکشی نہ کرو۔
کہا جاتا ہے کہ حضرت حسینؓ نے ایک قانونی حکومت کے خلاف بغاوت کی تھی اس طرح یزید کی حکومت کو برحق ثابت کرنے اور حضرت حسینؓ کے اقدام کو مطعون کرنے اور اس کی اہمیت کو گھٹانے کی کوشش کی جاتی ہے۔
حالانکہ کسی حکومت کے قانونی ہونے کے لیے یہی ضروری نہیں کہ لوگ اس کی عملداری کو تسلیم کرلیں اور اس کے قانون کے آگے جھک جائیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ خود قانون کے مطابق وجود میں آئی ہو۔
اسلام کے نقطۂ نظر سے قانونی حکومت صرف وہی ہوسکتی ہے جسے مسلم عوام نے کسی جبر و اکراہ کے بغیر اپنی مرضی سے منتخب کیا ہو اور جو

شریعتِ اسلامی کو قانون سازی کا ماخذ و منبع تسلیم کرتی ہو اور جس کی اجتماعی پالیسی اللہ اور اس کے رسول کے دیئے ہوئے نظریات کے مطابق ہو یزید کی حکومت شریعتِ اسلامی کو قانونِ ملکی تسلیم کرنے کے سوا کسی اور اصول پر پوری نہیں اترتی تھی۔ وہ عامۃ المسلمین کے بغیر ان پر اوپر سے مسلط کی گئی تھی اور ان کی بیعت جبر و کراہ کی بیعت تھی چنانچہ یہی وجہ ہے کہ خود بیعت کرنے والوں کی نظریں اسے وہ تقدیس حاصل نہیں تھی۔ جو اسے آج دی جا رہی ہے اور وہ اس کے خلاف بار بار بغاوتیں کرتے رہے۔ خود ائمہ فقہا نے بھی ایسی غیر قانونی حکومت کے خلاف خروج کو جائز سمجھا ہے عباسی خلیفہ منصور کے خلاف نفس ذکیہ نے خروج کیا تو امام ابو حنیفہ نے ان کی اخلاقی حمایت کی۔ یہ صرف ایک مثال ہے ایسی متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ وہ احادیثِ رسولؐ جنھیں اس حکومت کو تقدیس اور جواز کا رنگ دینے کے لئے پیش کیا جاتا ہے، ہمارے نزدیک ان میں دی ہوئی ہدایات صرف اس قانونی حکومت کے لیے ہیں جسے مسلمانوں نے خود اپنی مرضی سے جبر و کراہ کے بغیر منتخب کیا ہو اور اس انتخاب کے بعد اس میں بگاڑ رونما ہو جائے۔ اور وہ غلط راستے پر گامزن ہو جائے۔ ایسی حکومت کے بارے میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جب تک وہ مسلمانوں کو نماز روزے سے نہ روکے اس کی اطاعت کی جائے اور اس کے خلاف خروج نہ کیا جائے۔ بنا بریں یزید کی غیر قانونی حکومت کو ان احادیثِ رسولؐ کا تحفظ حاصل نہیں ہو سکتا۔

غیر قانونی حکومت کے خلاف جدّ و جُہد کا حق

حضرت حسینؓ کی نظر میں بھی یقیناً یہ احادیث ہوں گی لیکن انہوں نے نہ

صرف یزید کی غیر قانونی حکومت کو تسلیم نہیں کیا بلکہ اس کے خلاف محاذ قائم کرنے کے کوفہ روانہ ہوئے. یہ ایک الگ بحث ہے کہ بعد میں کوفیوں نے ان سے وفا نہ کی. بہر حال یہ بات واضح ہے کہ انہوں نے جب دیکھا کہ اسلام میں نظامِ حکومت کو جن بنیادوں پر قائم کیا گیا تھا ان کو ڈھا کر نئی بنیادوں پر نیا نظامِ حکومت استوار کیا جا رہا ہے تو وہ مدینہ منورہ سے نکلے. آپ کے خیر خواہوں نے ہر چند روکا مگر آپ دیکھ رہے تھے کہ خاموشی کا وقت نہیں ہے اگر خاموش بیٹھ گئے تو قیامت تک کے لیے ایک غلط نظیر قائم ہو جائے گی اور اس غلط نظیر کی آڑ لے کر ہر ضلالت اور گمراہی کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت کیا جانے لگے گا. حضرت حسینؓ نے حُر کے لشکریوں کو مخاطب کر کے کہا تھا:

"ان لوگوں (بنو امیہ) نے شیطان کی حکومت قبول کی ہے اور رحمٰن کی اطاعت چھوڑ دی ہے. ملک میں فساد پھیلایا ہے. حدود اللہ کو بے کار کر دیا ہے. مالِ غنیمت میں اپنا حصہ زیادہ لیتے ہیں. خدا کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال کر دیا ہے اور حلال کردہ چیزوں کو حرام. اس لئے مجھے اس کے بدلنے کا حق ہے۔"

خانوادۂ نبوت کا فردِ جلیل ہونے کی حیثیت سے آپ سے بڑھ کر اور کون شخص ہو سکتا تھا جس پر اس شگاف کو بند کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہو. چنانچہ اس شگاف کو انہوں نے اپنا، اپنے جگر گوشوں، اپنے عزیزوں اور مٹھی بھر رفیقوں کا مہر دے کر بند کرنے کی کوشش کی. اگرچہ یہ شگاف بند نہ ہو سکا تاہم ان کا پاک خون قیامت تک کے لیے اسلامی تاریخ کے اوراق پر نقش چھوڑ گیا ہے کہ:

"بادشاہِ حقیقی اور حاکمِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ ہے اور ایک اسلامی ریاست میں

رحمٰن کی اطاعت کے بجائے شیطان کی حکومت قبول نہیں کی جاسکتی"

حضرت حسینؓ نے کربلا کے میدان میں جو قربانی دی وہ تاریخ کا مایۂ فخر وناز واقعہ ہے۔ یہ واقعہ ملّت بیضا کو ماتم اور نوحہ سرائی میں ڈوب جانے اور زندگی کا کاروبار معطل کر دینے کی دعوت نہیں دیتا۔ اور نہ غلط اور گمراہ کن تاویلات کا متحمل ہے بلکہ یہ سبق دیتا ہے کہ مسلمانوں کی زندگی کس طرح سعی وجہاد سے عبارت ہونی چاہیے۔ اور ضرورت کے وقت اپنے جگر گوشوں کو حق پر کس ذوق اور شوق اور صبر و توکّل کے ساتھ نچھاور کر دینا چاہیے۔

یہ واقعہ اپنے دامن میں یقین وایمان، جذب وسوز اور امید ورجا کا عظیم سرمایہ رکھتا ہے اسے ان ماتم سرائیوں اور سینہ کوبیوں اور تاویلاتی گورکھ دھندوں سے کیا تعلق جو انسان کو میدانِ عمل سے فرار کا سبق دے کر اور ناامیدی ومایوسی کی کہر میں ملفوف کر کے اس سے زندگی کے ولولے اور حرارت چھین لیتے ہیں اور مصافِ کارزار سے ہٹا کر مجلس آرائیوں کا خوگر بنا دیتی ہیں۔ شہادتِ حسین تو ایک پیغام ہے، زندہ وجاوداں پیغام:

ماسوا اللہ مسلماں بندہ نیست
پیشِ فرعونے سرش افگندہ نیست

حسینؓ کے مُقدّس خُون کا احترام کرو

ہمارا کوئی مدرسۂ فکر امام حسینؓ کی عظمت کا منکر نہیں۔ ہمارا لیبل شیعہ ہو، سنّی ہو، اہل حدیث، کچھ بھی ہو۔ امام حسینؓ ہمارے محترم ہیں۔ ہم ان کا نام ادب سے لینے کو اپنی سعادت اور ان کی قربانیوں کے گیت گانے اور ان کا احترام کرنے کو دین و دنیا کی فلاح کا موجب سمجھتے ہیں۔ یہ بات ہم میں قطعی طور پر غیر نزاعی اور مکمل طور پر مشترک ہے۔

ہم میں سے کوئی اس بات کا دعویٰ نہیں کرتا اور نہیں کر سکتا کہ شیعہ سُنی دو الگ "دین" ہیں۔ یہ بات مشترک ہے کہ شیعہ سنّی دو مسلک ہیں، دو دین نہیں۔ ایک دین کی دو مختلف تفسیریں ہیں۔ دو مختلف ذہنی روّیے ہیں جنھوں نے اپنے اپنے انداز میں دین کو سمجھا اور اپنے اپنے طریقے سے تاریخ کو پڑھا۔

تاریخ ایک علمی موضوع ہے اور اسے اپنے انداز میں پڑھنے پر کوئی دینی قدغن نہیں لگائی جا سکتی۔ دین کی تفسیر کے انداز بھی مختلف ہو سکتے ہیں اور اس اختلاف کے لاتعداد طریقوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

دوسرے لفظوں میں شیعہ اور سنّی مسالکِ فکر میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں۔ اختلاف صرف تفسیر و تعبیر کا ہے اور انسانی گروہ میں جن کا ذہن اس کے اعصاب پر ہر دوسری مخلوق سے زیادہ حاوی ہوتا ہے اس قسم کے ذہنی اختلافات کا نہ ہونا بعید از قیاس ہے۔ دو آدمیوں کے درمیان اختلاف رائے ہو سکتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ کروڑوں انسانوں میں اختلافِ رائے کا وجود نہ ہو۔۔۔؟ اختلاف رائے کا وجود نعمت بن

جاتا ہے اگر بنیادی مرکزیتِ عمل و وحدتِ فکر کو منتشر نہ کرے اور لعنت بن جاتا ہے اگر اس کی وجہ سے مرکزیتِ عمل اور وحدت منتشر ہو جائے۔

امتِ محمدیہ کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ ان دونوں اختلافات نے جب کبھی اس حد تک شدت اختیار کر لی کہ مرکزیتِ عمل اور وحدتِ فکر کو صدمہ پہنچا تو ملت پارہ پارہ ہو گئی۔ ہلاکو خان نے شیعہ و سنی دونوں کو "مسلمان" جان کر قتل کیا اور دجلہ و فرات دونوں کے خون سے رنگین ہو گئے۔ لیکن جب یہ اختلافات اپنے وجود کے باوجود بنیادی مرکزیتِ عمل اور وحدتِ فکر کے ساتھ پیوستہ رہے اور اس کے تحت رہ کر اپنے اپنے طور پر قائم رہے عظیم سلطنتیں ابھریں اور دنیا کی جغرافیائی حدیں ٹوٹ ٹوٹ گئیں۔ تاریخ ایک بار نہیں دس ہزار بار اس واقعہ کا تجربہ کر چکی ہے۔ قریب ترین تاریخ کا تجربہ پاکستان ہے۔ قائداعظم عقائد کے اعتبار سے شیعہ بتائے جاتے ہیں اور ان کی قیادت کو سنیوں نے کبھی اس بنا پر چیلنج نہیں کیا۔ ہم سب نے مل کر دنیا کا نقشہ بدل دیا۔ اس سے بھی زیادہ قریب تر ماضی میں بھارت کا حملہ تھا اور اس محاذ پر شیعہ اور سنی جس انداز میں یک جان ہوئے وہ کسی کی یاد سے باہر کی چیز نہیں ہے۔

لیکن اس کے باوجود یہ بات حیرت انگیز ہے کہ ملک کے زعما اور عمائدین سلطنت کو یہ فکر لاحق ہے کہ مرکزیتِ عمل اور وحدت فکر کے لئے امام حسین رضی اللہ عنہ کی عظیم قربانی کی یاد مناتے وقت ہم آپس میں دست و گریبان نہ ہو جائیں۔ اس کے لئے اپیلیں کی جا رہی ہیں اور شیعہ سنی اتحاد کمیٹیاں قائم ہو رہی ہیں۔

کیا یہ اپنی ذات میں ہم پر ایک بھرپور طنز نہیں ہے؟ ہندو مسلم اتحاد کمیٹیاں کبھی بنا کرتی تھیں۔ ان کی نہج پر یہ شیعہ سنی اتحاد کمیٹیاں ہماری کس کمزوری کا اظہار ہیں؟

اگر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو محسوس ہو گا کہ کمزوری کے وجود سے

انکار ممکن نہیں ہے۔ ہم ایک دوسرے کے جذبات کا احترام نہیں کرتے اور ہم میں ایسے "ایجی ٹیٹر" موجود ہیں جو ایک دوسرے کے جذبات کی جراحت ہی کو اپنا مال تجارت سمجھتے ہیں ان "ایجی ٹیٹروں" کو حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کد ہے اور نہ محبت۔ یہ محبت کو بھی اپنے مفاد کے لیئے استعمال کرتے اور کد کو بھی اپنی روٹیوں کے لیے فروخت کرتے ہیں۔

ایک صحت مند معاشرے میں اس قسم کے گراں فروش ایجی ٹیٹروں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہونی چاہیئے اور ہمیں یقین ہے کہ پاکستانی معاشرے میں انہیں کوئی جگہ نہیں ملے گی۔

ضرورت ہے کہ ہم محرم الحرام یعنی عظیم یادوں کے مہینے میں اپنے اپنے فروعی اور طالبِ علمانہ اختلافات کو اپنی ذات تک محدود رکھیں اور ایک دوسرے کا احترام کریں کہ یہی احترام مرکزیتِ عمل اور وحدت فکر کا احترام ہے۔ اور اس کے لئے حسینؓ رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے اپنے مقدس خون کی قربانی دی تھی۔ اس کا احترام نہ کرنا حسینؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قربانی کی بے ادبی کرنا اور ان کی پاک اور منزہ روح کو تکلیف پہنچانا ہے۔

نتائج و عبر

ہم اس کتاب کے ابتدائی اوراق میں نہایت وضاحت سے کہہ چکے ہیں کہ سانحہ کربلا عالمی تاریخ کے چند ایسے اہم واقعات میں سے ہے جنھوں نے تاریخ کے دھارے کا رُخ یکسر بدل دیا ہے۔ اسلامی تاریخ میں تو اس سانحہء عظیم کی کوئی نظیر ہے ہی نہیں کیونکہ اس سانحے کی بدولت اس رسولؐ کا خانوادہ جو بارگاہِ ایزدی کی طرف سے انسانوں کی ہدایت کے لیے آخری پیغام لے کر آیا تھا خود افرادِ اُمّت کے ہاتھوں تقریباً منقطع ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی سیاست اور حکومت کی وہ اعلیٰ اور ارفع اقدار بھی پامالی کی آخری حد تک پہنچ گئی تھیں جنھیں پیغمبرِ آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلّم نے منشائے ایزدی اور تائیدِ وحی سے انسانوں کی فلاح و بہبود کے لیے وضع فرمایا تھا۔ سانحہ چونکہ بہت بڑا اور عدیم النظیر تھا اس لیے اس سے جو نتائج مرتب ہوئے وہ بھی بڑے اہم اور دور رس تھے۔

اسلامی طرزِ جمہُوریت پر کاری وار

ظہورِ اسلام کے وقت اس وقت کی متمدن دنیا کا ایک بڑا حصہ دو بڑی استبدادی قُوّتوں کی گرفت میں تھا۔ یہ استبدادی قوتیں قیصریت اور کسرائیت کے ناموں سے معروف ہیں۔ جب اسلام کا پیغام لوگوں کو اپنی طرف کھینچنے لگا تو سب سے پہلے اِنھیں دو قوّتوں کو اپنے لیے خطرہ محسُوس ہُوا اور پھر یہی دو قوتیں یکے بعد دیگرے

اسلام کی ابھرتی ہوئی قوّت کے ساتھ متصادم بھی ہوئیں۔ کیونکہ انھوں نے یہ جان لیا تھا کہ "لاسلاطین، لاکلیسا، لاالٰہ" کا نعرہ بلند کرنے والی یہ نئی قوت نوعِ انسانی کے خوابیدہ ضمیروں اور پوشیدہ قوتوں کو بیدار کرنے میں کامیاب ہوگئی تو فکرِ انسانی میں ایسا تموج پیدا ہوگا جس میں قیصریت اور کسرائیت کی بظاہر مستحکم دیواریں خس وخاشاک کی طرح بہہ جائیں گی۔

چنانچہ اسلام نے واقعتاً خوابیدہ قوّتوں کو بیدار کرکے انھیں اس قابل بنا دیا کہ وہ فانی انسانوں کی جاہ و عظمت کے سامنے سرجھکانے کی بجائے انھیں خدائے لم یزل کے آستانے پر جھکنے کے لیے مجبور کر دیں۔ مسلمان اگرچہ تعداد میں بہت کم تھے لیکن توحید پرستی نے اُن کو اتنی قوّت عطا کردی کہ انھوں نے قیصریت اور کسرائیت کے بُتوں کو پاش پاش کر دیا۔

اسلام نے قیصریت اور کسرائیت کے نظام کو چیلنج کیا مگر اُسے ان انسانوں سے کوئی کد نہ تھی جو اس نظام کی پیداوار تھے۔ اسلام کی طرف سے قیصر اور کسریٰ کو کھلے الفاظ میں یہ دعوت دی گئی کہ اسلامی نظام میں جو اللہ تعالیٰ کے ارشادات کے مطابق انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے ایک مکمل نظامِ ہدایت ہے، شامل ہو جائیں تو اسے ان سے کوئی تعرّض نہ ہوگا البتہ ان کے طریقِ جہانبانی کو منشائے فطرت کے مطابق کر دیا جائے گا اور اگر وہ منشائے فطرت کو پورا کرنے کے لیے اسلام کے ساتھ تعاون کریں گے تو وہ مسلمانوں کے بھائی ہوں گے اور بھائی ہونے کی حیثیت سے مسلمان ان کی ذات، ان کی ذاتی متاع، ان کے ناموس اور ان کی عزت کے محافظ ہوں گے۔

ظاہر ہے کہ جو دین قیصریت اور کسرائیت کو مٹا کر اخوت، مُساوات اور جمہوریت کا ایک عالمگیر نظام قائم کرنے کے لیے آیا تھا وہ کس طرح گوارہ کر سکتا

تھا کہ خود اس دین کی پیروی کرنے والے لوگوں کے اندر نئے قیصر و کسریٰ پیدا ہو جائیں اور وہ عام انسانوں کی فلاح و بہبود پر ذاتی فلاح و بہبود کو مقدم رکھیں۔ بیت المال جو قومی امانت ہے اسے ذاتی ملکیت بنا کر جا و بے جا طور پر اپنے تصرف میں لائیں اور جمہور کی رائے کے خلاف چل کر خلافت اور نیابت کو اپنے خاندان کے لیے مختص کرلیں اور حاکمیت کو جو اسلامی اصولوں کے مطابق اپنے ہر قول اور فعل کے لیے خدا اور رسولؐ اور مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ کے سامنے جواب دہ ہوتی ہے، ملوکیت میں بدل کر کسی کے سامنے جواب دہ نہ ہونے والی مطلق العنان بادشاہت بنالیں۔

سانحۂ کربلا حقیقت میں اس اسلامی جمہوری طرزِ انتخاب پر ایک نہایت کاری وار ثابت ہوا اور اس سے اسلامی آئینِ حکومت کے جسد پر ایسے گہرے زخم لگے جو صدیاں گزر جانے پر آج تک پوری طرح مندمل نہیں ہو سکے۔

اسلامی نظامِ عدل کی پامالی

یزید نے جس مطلق العنان حاکمیت کا مظاہرہ کیا اس کی وجہ سے عدل و انصاف کی وہ اعلیٰ اور ارفع قدریں جن کی وجہ سے دینِ اسلام کو باقی تمام نظام ہائے حیات پر تفوّق حاصل ہوتا ہے بری طرح پامال ہو گئیں۔ امیر چونکہ مسلمان عوام کے سامنے جواب دہ نہ رہا اور صرف عوام یا عوامی نمائندے ہی اللہ تعالیٰ کے قانون کی روشنی میں اس کا محاسبہ کر سکتے تھے اس لیے اس پر قانونِ خداوندی کی گرفت ایسی مضبوط نہ رہی، جیسی خلافتِ راشدہ کے زمانے میں تھی۔ مطلق العنان حکومت کی وجہ سے عُمّالِ حکومت بھی اللہ اور رسول کی خوشنودی حاصل کرنے کی بجائے اپنے امیر کی خوشنودی حاصل کرنے کی فکر میں رہنے لگے۔ لہٰذا عوام کو امیرِ اعلیٰ کا مطیع و فرمانبردار

بنانے کے لیے انھوں نے ہر قسم کے جبر و تشدّد کو اپنے لیے جائز قرار دے لیا۔ امیر مُعاویؓ ہی کے زمانے میں عُمالِ حکومت نے عوام پر تشدّد کے دروازے کھول دیے تھے اور ایسے لوگوں کو جو حضرت علیؓ کے حامی اور مخلصین میں سے تھے سخت ایذائیں دینا شروع کر دی تھیں بلکہ قتل و غارت سے بھی دریغ نہ کیا۔ سیاسی انتقام کے طور پر قتل و غارت کے واقعات میں سے حجر بن عدی الکندی اور ان کے چند ساتھیوں کا سفاکانہ قتل ایک نہایت المناک مثال ہے۔

اسلامی عدل و انصاف کی پامالی کی واضح مثال ہمیں اس خُطبے میں ملتی ہے جو ۵۰ ھ میں زیاد نے جناب مغیرہؓ بن شعبہ کی جگہ کوفے کا حاکم متعین ہونے پر دیا۔ اس نے اپنے خطبے کے دوران کہا :

”میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ غلام کے ساتھ آقا کو، مُسافر کے ساتھ مُقیم کو، جانے والے کے ساتھ آنے والے کو، نافرمان کے ساتھ فرمانبردار کو اور بیمار کے ساتھ تندرست کو پکڑوں گا۔

تم نے نئی نئی باتیں پیدا کیں تو ہم نے بھی ہر گناہ کی سزا مقرّر کی ہے۔ پس اگر کوئی کسی کو ڈبائے گا تو ہم اس کو غرق کر دیں گے۔ اگر کوئی کسی کو جلائے گا تو ہم اس کو آگ میں جھونک دیں گے۔ جو کسی کے گھر میں نقب لگائے گا ہم اس کے دل میں نقب لگائیں گے جو کوئی قبر اکھاڑے گا ہم اس کو قبر میں زندہ گاڑ دیں گے۔

جس نے بھی عوام میں شورش اور بے چینی کی کوئی بات پیدا کی میں اس کو قتل کر دوں گا۔“

اس خطبے میں زیاد نے اپنے مُتعلق کہا :

”اے لوگو! ہم تمہارے حاکم اور محافظ ہیں۔ خدا نے ہم کو جو اقتدار دیا

ہے اس کی بدولت ہم تم پر حکمرانی کرتے ہیں اور جس خراج کا خدا نے
نے ہمیں حقدار بنایا ہے اس کے بدلے میں ہم تمہاری حمایت اور
حفاظت کر رہے ہیں[۵]۔"

اس خطبے میں زیاد نے اس قابلِ نفرت سیاست کا اعلان کیا ہے جس پر وہ اپنی گورنری کے دور میں عمل پیرا رہا۔ یہ قابلِ نفرت سیاست ایسی تھی جس کا نہ اسلام سے کچھ واسطہ تھا نہ مسلمان اس سے آشنا تھے۔ اس نے اپنے مربّی اور سرپرست کی حکومت مستحکم کرنے کے لیے سزا کے ایسے پیمانے وضع کیے جو انتہائی ظالمانہ اور متشددانہ تھے اور اسلام کے جزا اور سزا کے اصولوں کے ساتھ انھیں قطعاً کوئی نسبت نہ تھی کیونکہ اسلام اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ اگر چور گھر میں نقب لگائے تو چور کے دل میں نقب لگائی جائے۔ کچھ لوگ مُردوں کی قبریں اکھاڑتے ہیں تو اسلام ان کو زندہ درگور کرنے کا حکم نہیں دیتا۔ اسلام شبہے کی بنا پر سزائیں نہیں دیتا بلکہ شبہے سے سزا کا تدارک کرتا ہے۔ اسلام شک کی بنا پر کسی کو قتل کرنے کی اجازت نہیں دیتا بلکہ جُرم سرزد ہونے اور اس کے متعلّق ثقہ شہادتیں فراہم ہونے کے بعد جرم کے مُطابق سزا دینے کی اجازت دیتا ہے۔ اسلام کسی حاکم یا خلیفہ کو یہ کہنے کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ لوگوں پر اس لیے حکومت کر رہا ہے کہ اللہ نے اُسے طاقت دی ہے اور خراج کا حقدار بنایا ہے۔

جبر و تشدّد کے یہ واقعات سانحۂ کربلا سے پہلے کے ہیں۔ امام حسین رضؓ اور بہت سے دوسرے جلیل القدر صحابیؓ ان واقعات پر سخت رنجیدہ تھے۔ اسلامی نظامِ عدل و انصاف کے اصولوں کی ایسی کھلی پامالی ان سب کے لیے سوہانِ رُوح تھی بہت سے جلیل القدر صحابیؓ ان حالات کو دیکھ دیکھ کر معاملاتِ دُنیا سے بالکل کنارہ کش

---

[۵] ترجمہ "حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ" از ڈاکٹر طٰہٰ حسین۔ صفحہ ۵۳۴

ہو چکے تھے۔ لیکن جب ظلم و ستم حد سے گزر گیا تو امام عالی مقام نے مناسب سمجھا کہ بُرائی اور ظلم و تشدّد کے اس سیلاب کو اپنی پُوری قوت سے روکنے کی کوشش فرمائیں۔ سانحہ کربلا اس بھرپور کوشش کا دوسرا نام ہے۔ یہ کوشش ہر چند وقتی طور پر ناکام ہو گئی لیکن تھوڑے ہی عرصے میں بنو امیّہ کی حکومت اور قیادت کا دَور ختم ہو گیا اور ختم بھی ایسا ہوا کہ بلادِ عرب و عجم سے اس تناور درخت کی جڑیں ہی اُکھڑ گئیں۔ صرف ایک شاخ اُندلس کی سرزمین میں پہنچ کر اس خوفناک ردِّعمل سے محفوظ رہ گئی، جس سے بنو امیّہ کو دوچار ہونا پڑا۔

مِلّتِ اسلامیہ میں باہمی افتراق

حضرت عُثمانِ غنیؓ کے سانحہ شہادت کے ساتھ ہی مِلّتِ اِسلامیہ کے اندر مستقل افتراق و عناد کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ کربلا کا سانحہ اس افتراق اور عناد کا ایک منطقی نتیجہ تھا لیکن اس منطقی نتیجے پر بات ختم نہ ہوئی بلکہ تشتُّت و افتراق بڑھتا ہی چلا گیا۔ سانحہ کربلا کے ردِعمل کے طور پر مدینہ طیبہ اور مکّہ مکرّمہ میں حکومت کے خلاف بے چینی اور بے زاری پیدا ہوئی اور حکامِ بنو امیّہ نے اُسے دبانے کے لیے جو طریقے اختیار کیے اس سے لوگوں کے دلوں میں بنو امیّہ کے خلاف نفرت پیدا ہو گئی۔ اِنتقام در اِنتقام کے جو چکّر چلائے گئے ان سے مِلّت کا اتحاد پارہ پارہ ہو گیا اور جیسے جیسے وقت گزرتا گیا مِلّت کے دو بڑے گروہوں کے درمیان خلیج بڑھتی ہی چلی گئی۔ تمام عالمِ اسلام غدّاریوں اور سازشوں کا شکار ہو گیا اور اگرچہ بنو امیّہ اور اس کے بعد بنو عبّاس کے بعض انتہائی قابل اور ہوشمند خلفاء نے مسلمانوں کی مرکزی قوّت کو متاثر نہ ہونے دیا اور اپنی وسیع النظری اور وسیع القلبی کی بنا پر اختلاف و افتراق کی شدّت کو کم کرنے کی کوششیں کرتے رہے پھر بھی تمام

مسلمانوں کو کسی وقت بھی کاملاً متحد نہ کر سکے بلکہ خود بنو عباس کی خلافت کے زوال میں اس افتراق کا ہاتھ تھا۔

اِسلام سے اِجتماعی مقاصد کو نقصان

حضرت عثمانِ غنی رضؓ کے عہدِ خلافت کے نصف آخر سے جب بنو امیہ اور بنو ہاشم کی باہمی رقابتیں اور عداوتیں جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک سے تحلیل ہو گئی تھیں، عود کر آئیں تو ملّت اسلامیہ کے اندر باہمی افتراق کا ایسا دروازہ کھل گیا جو آج تک بند نہیں ہو سکا۔ یہ افتراق جو ابتداً محض سیاسی تھا رفتہ رفتہ مذہبی صورت اختیار کر گیا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اس مذہبی افتراق میں کمی کی جگہ اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس افتراق کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قوت جسے دینِ اِسلام کے دشمنوں کے خلاف استعمال ہونا چاہیے تھا، آپس میں ایک دوسرے کے خلاف استعمال ہوتی رہی، مسلسل صدیوں تک استعمال ہوتی رہی اور آج بھی کہیں کہیں استعمال ہو رہی ہے۔

حضرت عثمانِ غنیؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دورِ خلافت میں اسی افتراق کی وجہ سے اسلامی فتوحات کا سلسلہ تقریباً معطل ہو کر رہ گیا تھا۔ اُموی دَور میں فتوحات کا سلسلہ پھر چل نکلا لیکن اس دَور کے اواخر میں ملّت پھر خانہ جنگیوں میں مبتلا ہو گئی۔ عبّاسی دور کی شان و شوکت اور اجتماعی ترقی تاریخِ اسلام کا ایک روشن باب ہے لیکن اس دور میں افتراق نے دُوسرے دروازوں سے بھی سر اُٹھایا اور شیعہ سُنّی اختلافات بھی بدستور رہے۔

اس افتراق کا افسوسناک ترین دَور وہ ہے جب ترک فتح و نصرت کے پرچم بلند کیے ہوئے وسطی یورپ کی طرف بڑھتے چلے جا رہے تھے کہ اچانک انھیں

مشرقی محاذ کی طرف لوٹنا پڑا جس کی وجہ سے یورپ میں اسلامی فتوحات کا سلسلہ رُک گیا اور مسلمانوں کی اجتماعی قوت اتنی کم ہو گئی کہ اس کے بعد اسلامی فوجوں کے قدم یورپ میں آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے ہٹنے لگے ۔ خود یورپی مُصنفین اور مؤرخین نے لکھا ہے کہ اگر چالدران کی جنگ جو ترکوں اور ایرانیوں کے درمیان ۲۳ر اگست ۱۵۱۴ء کو ہوئی نہ ہوتی تو یورپ میں ترک فوجوں کی پیش قدمی کا رُکنا محالات میں سے تھا اور عین ممکن تھا کہ پورا یورپ اسلام قبول کر لیتا جس سے دُنیا کی تاریخ بالکل بدل جاتی۔

برّصغیر ہند و پاکستان کا آخری دَور بھی مسلمانوں کے مذہبی تشتّت و افتراق کا افسوس ناک دَور ہے۔ دکن میں آخری عظیم مُغل فرماں روا اورنگ زیب عالمگیر کو اس مذہبی افتراق کی وجہ سے جنگ وجدل کا ایک طویل زمانہ دیکھنا پڑا جس کا نتیجہ مغل سلطنت کی کمزوری اور زوال کی صورت میں سامنے آیا۔ سلطنتِ خداداد میسُور کی تباہی کے پیچھے بھی یہی افتراق کارفرما تھا اور شمالی ہند کی مُسلمان حکُومتیں بھی اسی اِنتشار و افتراق کے باعث زوال پذیر ہُوئیں۔

مقامِ عبرت

انتہائی عبرت کا مقام یہ ہے کہ دشمنانِ اسلام ہر دَور اور ہر ملک میں مسلمانوں کے اس مذہبی افتراق کو اپنے مقاصد کے لیے نہایت کامیابی کے ساتھ استعمال کرتے رہے اور مسلمان نہایت آسانی سے ان کے آلۂ کار بنتے رہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح عبداللہ ابن سبا۔ جو یہوُدی النسل تھا' اسلام کا لبادہ اوڑھ کر مسلمانوں کے درمیان افتراق پیدا کرنے کے لیے سرگرم کار رہا اور کس طرح اس نے نہایت چالاکی اور عیاری کے ساتھ مسلمانوں کی جمعیّت کو اس طرح تقسیم کر دیا کہ وہ مستقلاً دو فرقے بن گئے اور

فرقے بھی ایسے کہ ایک دُوسرے کے جانی دُشمن نظر آنے لگے۔

جب یورپین اقوام بالخصوص انگریزوں کو عالمی سیاست میں بالادستی حاصل ہوئی تو انھوں نے ایسے سیاسی حربے استعمال کیے کہ مختلف مسلمان فرقوں کے لوگ آپس میں لڑتے جھگڑتے اور اپنی قوتوں کو ضائع کرتے رہے۔ انگریزوں کے نقش قدم پر چل کر دوسری اقوام نے بھی مسلمانوں کے مختلف العقیدہ گروہوں میں اختلاف و افتراق کو خوب ہوا دی اور عام طور پر کامیاب ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ ۱۹۳۷ء میں جب برعظیم پاک و ہند کے چند صوبوں میں کانگرسی حکومتیں بنیں تو انھوں نے بھی مختلف مقامات پر یہی حربہ استعمال کیا اور یو۔ پی میں تو وہ اپنے منصوبوں میں خاصے کامیاب بھی رہے۔

موجودہ دَور میں مسلمانوں کو اپنے آباو اجداد کی تاریخ سے سبق حاصل کرنا چاہیئے اور ایسے عناصر سے ہمیشہ خبردار رہنا چاہیے جو مسلمانوں کے اندر افتراق پیدا کر کے اپنے مقاصد حل کرنا چاہتے ہوں۔ جب مسلمان اقوام عقائد کی بنا پر خانہ جنگیوں کو بالکل خیرباد کہہ دیں گی تبھی وہ دُنیا (اور عقبیٰ میں بھی) سربلند ہو سکیں گی اور تبھی وہ عظیم مقاصد بھی پورے ہو سکیں گے جن کے لیے امام حسینؓ نے کربلا کے میدان میں اِتنی عظیم قُربانیاں دیں۔

ذکرِ حسینؓ

کوثر نیازی

فیروز سنز لمیٹڈ لاہور